محمد حنیف رامے

پنجاب کا مقدمہ

جنگ پبلشرز

پنجاب کا مقدمہ

محمد حنیف رامے

جنگ پبلشرز

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

پہلی اشاعت ...... جولائی ۱۹۸۵ء

دوسری اشاعت ..... جولائی ۱۹۸۶ء

ترامیم و اضافہ کے ساتھ

تیسری اشاعت .... نومبر ۱۹۸۷ء

تعداد .... ایک ہزار

قیمت .... -/۷۰ روپے

مطبع .... جنگ پبلشرز

۱۳۔ سر آغا خان روڈ۔ لاہور

جنگ پبلشرز

پانچ کروڑ بے زبان پنجابی عوام کے نام

اس معذرت کے ساتھ کہ میں نے یہ کتاب پنجابی میں نہیں لکھی۔ مگر شاید "پنجاب کا مقدمہ" مجھے اردو میں اس لئے پیش کرنا پڑا کہ پڑھے لکھے پنجابیوں نے پنجابی کو چھوڑ دیا ہے۔

ترتیب

۱۔ میرا پنجاب ۱۱

۲۔ پنجاب اور پاکستان ۲۳

۳۔ تاریخ کا تشدد ۳۷

۴۔ قیادت کا فقدان ۵۱

۵۔ وفاقیت کے تقاضے ۶۹

۶۔ ون یونٹ اور مشرقی پاکستان ۸۱

۷۔ پنجاب کی ذمہ داری ۹۵

۸۔ پانچ جواں مرد پنجابی ۱۰۹

۹۔ صوبائی خود مختاری کا مسئلہ ۱۳۱

۱۰۔ پانی کا مسئلہ ۱۴۱

۱۱۔ عبدالغفار خان اور ولی خان سے سوال جواب ۱۶۱

پیش لفظ

جیوے پنجاب......!

......یہ میرے دل کا نعرہ ہے۔

لیکن میرا دل یہ نعرہ ہمیشہ جیوے پاکستان کے منظر و پس منظر ہی میں لگاتا ہے۔

پنجاب کے بارے میں میری اس کاوش کا اوّل و آخر مقصد بے شک اہلِ پنجاب کو جھنجھوڑنا ہے' البتہ میں انہیں صرف پنجاب کی عظمت و سربلندی کے لئے نہیں پاکستان کے استحکام اور یکجہتی کے لئے بھی جھنجھوڑ رہا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ پنجاب نے پنجابیت اختیار نہ کی تو وہ پاکستان کو بھی لے ڈوبے گا۔

میں نے یہ کتاب خالصتاً حافظے سے لکھی ہے۔ پھر اس کا بیشتر حصہ ابتداءً بولا گیا تھا۔ دراصل میں اسے کوئی بوجھل دستاویز بنانا ہی نہ چاہتا تھا۔ جن لوگوں کو اس میں علم و فضل کی کمی نظر آئے' وہ مجھے سیاست دان سمجھ کر بخش دیں کیونکہ میرے لئے یہ کتاب ایک ایسا سیاسی عمل ہے جس کی ہماری قومی تاریخ کے اس نازک اور پیچیدہ مرحلے پر شدید ضرورت تھی۔ ویسے بھی وہ علم و فضل کس کام کا جو حقوق کی جدوجہد میں مصروف محکوم و مجبور اور مظلوم و مقہور عوام کا ہم رکاب نہ ہو اور ان کی زبان میں نہ ڈھل سکے۔

اس کتاب کا مسودہ میرے مندرجہ ذیل کرم فرماؤں نے پڑھا اور مجھے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا: ڈاکٹر مبشر حسن' پروفیسر محمد عثمان' جناب مسعود کھدر پوش' محترم عبداللہ ملک' راجہ غالب احمد' سید سبط الحسن ضیغم' محترم منو بھائی' جناب نجم حسین سید' میاں محمد اسلم اور بیرسٹر نسیم احمد باجوہ۔ بہرحال یہ حضرات اس کتاب کی خوبیوں کے تو ذمہ دار ہیں لیکن اس کی تمام تر خامیاں صرف اور صرف میری ہیں۔ ان کے علاوہ جناب ضیاء شاہد' محترم ارشاد احمد پنجابی اور بشیر حسین بھٹی صاحب نے کتاب کے آٹھویں باب ، پانچ جواں مرد پنجابی...... کی تیاری میں خصوصی معاونت فرمائی۔ میں ان تمام صاحبوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۵۱- سی ۲' گلبرگ ۳

......لاہور......

محمد حنیف رامے

پہلا باب

میرا پنجاب

مجھے اپنے وجود اور پنجاب کے وجود میں ہمیشہ ایک گہری مماثلت کا احساس رہا ہے۔

جس طرح میرے بدن کا خون سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخونوں تک پھیلی ہوئی رگوں اور شریانوں کے ذریعے بالآخر میرے دل تک جا پہنچتا ہے' اسی طرح پنجاب کے پانچوں دریاؤں اور ان میں گرنے والی ندیوں کا سارا پانی پنجند میں جمع ہو جاتا ہے۔ یا پھر جیسے پانچ انگلیاں میرے ہاتھ کی ہتھیلی سے پھوٹتی اور پھر اسی میں جذب ہو جاتی ہیں' پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کا جغرافیہ بھی کچھ اسی شکل وصورت میں سامنے آتا ہے۔ میں نے زندگی میں جب بھی اپنے ہاتھ کی کھلی ہتھیلی کو آنکھ بھر کے دیکھا ہے' پنج تن پاک کے ساتھ ساتھ پنجاب کا خیال میرے دل میں کوند گیا ہے۔

پنجاب کے پانچ دریاؤں کی طرح میری ماں کے بھی پانچ بیٹے تھے۔ نذیر' بشیر' رشید' حنیف اور حفیظ۔ سکول میں جغرافیے کی جو کتاب پڑھائی جاتی تھی اس میں پنجاب کے دریاؤں کا نام اس ترتیب سے درج تھا: ستلج' بیاس' راوی' چناب اور جہلم۔ ابھی یہ شعور نہ تھا کہ ستلج اور بیاس دونوں ایک ہی دریا ہیں اور پنجاب کا پانچواں دریا دراصل سندھ ہے' جو اٹک سے رحیم یار خان تک پنجاب کے سینے پر بہتا ہے۔ بہرحال پنجاب کے پانچ دریاؤں اور اپنے پانچ بھائیوں میں بھی مجھے ایک مماثلت نظر آتی تھی۔ بلکہ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہونے کے اعتبار سے مجھے چوتھا دریا چناب اپنے ساتھ خصوصاً قریب تر محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی میں ضلع شیخوپورہ کے جس گاؤں میں پیدا ہوا تھا وہ تحصیل ننکانہ صاحب کے تھانہ بڑا گھر میں واقع تھا اور یہ سارا علاقہ دریائے چناب سے نکلنے والی نہر اپر

چناب سے سیراب ہوتا تھا۔ مجھے ہمیشہ یاد رہا کہ پنجاب کی مٹی اور چناب کے پانی سے میرا خمیر اٹھا ہے۔ پنجاب اور چناب کے لفظوں پر نظر پڑتی تو ان میں بھی مشابہت دکھائی دیتی تھی۔

میں پانچ برس کا تھا کہ میرے میاں جی چودھری غلام حسین، چک نمبر ۵ بڑا گھر سے اپنے آبائی شہر لاہور واپس آ گئے اور یوں میرا دانہ پانی دریائے چناب سے دریائے راوی اور نہر اپر چناب سے میاں میر نہر کی طرف منتقل ہو گیا۔ ایف اے سے ایم اے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم رہنے کے ناتے راوین تو بن ہی گیا تھا اوپر سے گذشتہ بہت سے سال دریائے راوی سے پھوٹنے والی میاں میر نہر کے کنارے یا اس کے آس پاس رہتے گزرے ہیں۔ صبح و شام، آتے جاتے، اس بانکی اور البیلی نہر میں بہتے پانی کو دیکھ کر میں نے پنجاب کے پانچوں میٹھے دریاؤں کی مہک اور لہک اپنے دل میں محسوس کی ہے۔

بہتے پانی کے علاوہ پنجاب میں رہتے ہوئے میں نے یہاں کی دو اور چیزیں بہت شدت سے پہچانی ہیں۔ ایک تیز دھوپ اور دوسری نرم چھاؤں۔

عام طور پر سال ڈیڑھ سال کا بچہ تھوڑی بہت باتیں کرنے لگ جاتا ہے مگر میں تین سال کا ہو گیا تھا اور ایک لفظ بھی بول کر نہ دیا تھا۔ میرے میاں جی اس سلسلے میں بہت پریشان تھے۔ دوا اور دعا کسی کا اثر نہ ہو رہا تھا۔ ٹونے ٹوٹکے تک آزما لئے گئے چنانچہ کبوتروں اور چڑیوں کا جھوٹا پانی پلا کر بھی دیکھ لیا گیا مگر میری زبان کی گرہ نہ کھلی۔ آخر ایک مرد درویش گاؤں میں وارد ہوئے۔ چودھری غلام حسین نے بہت آؤ آدر کی، اہل و عیال بھی سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ مجھ بے زبان پر بزرگوار کی نظر پڑی تو حکم ہوا کہ گاؤں بھر کے بچوں کو اکٹھا کیا جائے، ان کے لئے میٹھے چاول گھنگنیاں اور مرونڈا تیار کیا جائے، بچوں کو دھما چوکڑی مچانے کی کھلی چھٹی دی جائے اور مجھے ان میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ یہ دعوت اور دھما چوکڑی کئی روز چلی۔ میں نے ہم عمر بچوں کو بے باکانہ بولتے سن سن کر اپنے اندر ایک گہرا اور گرم ارتعاش محسوس کیا۔

اسی دعوت اور دھما چوکڑی کے دوران ایک روز، گھر کے کھلے آنگن کے بیچوں بیچ اُگے ہوئے گاؤں بھر میں سب سے میٹھے پیلو دینے والے وَن کے گھنے درخت کے زیر سایہ، میں اپنے میاں جی کے پاس کھڑا تھا جو بچوں کی خاطر تواضع کر رہے تھے کہ بے اختیار، میرے اندر ایک ترنگ اٹھی، میں نے میاں جی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے ان کا دامن کھینچا، پھر تیز دھوپ اور گھنی چھاؤں کی سرحد پر جا کھڑا ہوا اور تتلاتے ہوئے بولا:

ائیں دُھپ' ائیں ہاں
(ادھر دھوپ 'ادھر چھاؤں)

وہ دن اور آج کا دن 'یہی پہچانتے اور وضاحتیں کرتے عمر گزر گئی ہے کہ دھوپ کدھر اور چھاؤں کدھر ہے۔

پنجاب کی تیز دھوپ اور گھنی چھاؤں نے اس سرزمین کے باسیوں کو ایک جداگانہ کردار عطا کر دیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو اس کردار میں وہی تضاد ملتا ہے جو تیز دھوپ اور گھنی چھاؤں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ذرا غور سے اور تھوڑی ہمدردی کے ساتھ دیکھیں تو یہ تضاد ایک وحدت میں ڈھل جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ڈراما جبھی طاقتور ہوتا ہے کہ اس کے عناصر میں توانائی اور شدت ہو۔ میں نے خود اپنے وجود میں جوش کی تیز دھوپ اور ہوش کی گھنی چھاؤں کو بارہا ایک دوسرے سے گتھم گتھا لیکن پھر باہم شیر و شکر ہوتے دیکھا ہے۔ میرا تو یہی تجربہ اور تجزیہ ہے کہ دھوپ جس قدر تیز ہوگی چھاؤں اسی قدر گھنی ہوگی اور جو مزہ دھوپ چھاؤں کے میل جول میں ہے وہ نری دھوپ یا نری چھاؤں کے تسلسل میں ہرگز نہیں۔ شاید اسی لئے سیانوں نے برسات کے سہانے موسم کو دھوپ چھاؤں کا نام دے رکھا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ دُور سے دیکھنے والوں نے پنجاب کی صرف تیز دھوپ دیکھی ہے' وہ کبھی اس کی گھنی چھاؤں میں نہیں بیٹھے۔ حالانکہ دونوں سے یکساں بہرہ ور ہو کر ہی پنجاب کے اصل کردار کے بارے میں بصیرت نصیب ہو سکتی ہے۔

پنجاب کی تیز دھوپ نے اسے ایک جلال بخشا ہے۔ اس کے برعکس اس کی نرم چھاؤں اس کا رُخِ جمال ہے۔ اس جلال اور جمال کو ساتھ ساتھ رکھ کر ہی پنجاب کی حقیقی تصویر ابھرتی ہے۔ اگر صرف جلال کو پیشِ نظر رکھا جائے تو پنجاب کی وہ عجیب و غریب اور اَن مِل بے جوڑ تصویر بنتی ہے جو دوسروں نے دیکھی اور دکھائی ہے: کرخت' تند خو' تہذیب و شائستگی سے محروم' سنجیدگی اور گہرائی سے نابلد' شیخی باز' موقع پرست' مزاحمت کے جذبے سے عاری........... لیکن تیز دھوپ کے ساتھ ساتھ جب پنجاب کی گھنی چھاؤں کو بھی نگاہ میں رکھیں تو پنجاب کا وہ نقشِ جمال بنتا ہے جو میں نے پہلے اپنے دل میں دیکھا' پھر اپنی آنکھوں میں بسایا اور اب اربابِ وطن کے سامنے لا رہا ہوں۔ ہر معیاری تصویر کی طرح یہ نقش بھی دھوپ اور چھاؤں یا روشنی اور سایے کے صحیح امتزاج ہی سے بنا ہے۔ محض روشنی یا محض سایے سے تو تصویر یا نقش بنتا ہی نہیں۔

بے شک مہابھارت سے لے کر پانی پت کی لڑائیوں تک پنجاب مسلسل اور متواتر میدانِ کارزار بنا رہا ہے اور تاریخ میں صدیوں تک شمال سے جنوب کی طرف جانے اور ادھر سے واپس آنے والے حملہ آوروں کے قدموں تلے روندا گیا ہے لیکن اس کا اصل کردار یہ نہ تھا کہ اس نے حملہ آوروں کی توپیں کھینچ کر انہیں دلی اور آگرے کی راہ دکھادی ہو اور پھر انہیں واپس شمال تک پہنچنے کے لئے بار برداری مہیا کر دی ہو۔ پنجاب کو موقع پرست گردانے والوں کو یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ اسی پنجاب نے فاتح عالم سکندرِ اعظم کے بڈی دَل لشکروں کے خلاف ڈٹ جانے کی جراَت کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کے کردار کو راجہ پورس سے پہچاننے کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ پورس کے ہاتھیوں سے۔ ہاتھیوں کی پسپائی کے باوجود پورس کی نگاہ اتنی بلند اور جاں اتنی پرسوز تھی کہ جب سکندر نے پوچھا کہ بتاؤ تم سے کیا سلوک کیا جائے تو پورس نے سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تھا کہ وہی جو ایک خود مختار اور غیرت مند قوم کے حکمران کے شایانِ شان ہو۔

پنجاب نے مزاحمت کا ایک اور رنگ اس وقت دکھایا جب مغل شہنشاہ اکبر نے دینِ الٰہی کا چکر چلایا اور امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے اس مکروہ سازش کے خلاف سرہند شریف سے آواز اٹھائی اور نتیجے میں قید و بند کی کڑی صعوبتیں برداشت کیں۔

پنجاب میں مزاحمت کا یہ سلسلہ مغلوں کے دور کے دُلّا بھٹی سے انگریزوں کے دور کے احمد خان کھرل تک جاری رہا۔

یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ برصغیر ہند میں انگریزوں کا تسلط سب سے آخر میں جا کر پنجاب میں ہوا۔ پنجاب نے ایک سو سال سے کم عرصہ غلامی کا طوق پہنا جب کہ بنگال سمیت برصغیر کے کئی دوسرے صوبوں نے دو دو سو سال غلامی میں کاٹے۔ چنانچہ لاہور کے شاہی قلعے پر انگریزی راج قائم ہونے کی تاریخ ۱۸۴۹ء درج ہے۔ موجودہ پاکستان کے دوسرے صوبوں پر بھی پنجاب سے پہلے قبضہ ہو گیا تھا۔ سندھ ۱۸۴۳ء میں اور بلوچستان ۱۸۴۰ء میں انگریزی تسلط میں آیا تھا۔ جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے یاد رہے کہ وہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب ہی کا حصہ تھا جس کی سرحدیں کابل تک پھیلی ہوئی تھیں۔

ہمارے اپنے دور میں بھی پنجاب نے مزاحمت کی روش اور روایت قائم رکھی۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام ہو یا بھگت سنگھ اور اس کے انقلابی ساتھیوں کی پھانسیاں، مجلس احرار اسلام کی جانبازیاں ہوں، خاکساروں کی شہادتیں ہوں یا تحریک پاکستان کے کارکنوں کی گرفتاریاں...... پنجاب نے

اپنی پگڑی اور مونچھ کبھی نیچی نہیں ہونے دی۔ کو کالہر ' جٹا پگڑی سنبھال ' بھرتی بند تحریک ' ریشمی رومال ' غدر پارٹی ' انٹی رولٹ ایکٹ تحریک ' خلافت تحریک ' گوردوارہ سدھار تحریک ' ہجرت تحریک ' نہ مل ورتن تحریک ' نوجوان بھارت سبھا ' انڈین سوشلسٹ ری پبلکن آرمی ' نیلی پوش ' تحریک حریت کشمیر.......... جس طرح یہ سب نام ظلم اور جبر کے خلاف پنجاب کی مزاحمت سے عبارت ہیں ' تکلف برطرف ' اسی طرح پاکستان میں بھٹو مرحوم کے عہد میں حنیف رامے کا وہ سفر جو اس نے شاہی قلعے کے عقوبت خانے سے اٹک جیل تک طے کیا اور بھارت میں اندرا گاندھی کے دور میں جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کا وہ جامِ شہادت جو اس نے دربار صاحب امرتسر میں نوش کیا پنجاب کے سلسلۂ مزاحمت ہی کی تازہ ترین کڑیاں ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے پروردہ چند پنجابی جاگیرداروں نے عوامی اور قومی مفادات سے ضرور غداری کی لیکن اس طبقے سے غداری کے سوا اور توقع ہی کیا تھی۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اس سرزمین کے عوام کا اس موقع پر کیا کردار تھا۔ پنجاب کے قدیم درخت آج بھی اُن ہزاروں مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یاد کر کر کے آہیں بھرتے ہیں جن کی لاشوں کو انگریزوں نے پنجابی عوام کے جذبۂ حریت کو سرد کرنے کے لئے ان کی شاخوں سے لٹکا دیا تھا۔

پنجاب کی تیز دھوپ اور اس کے جلال نے اس کی رزمیہ شاعری میں رنگ باندھا ہے۔ چنانچہ سیف الملوک اور مرزا صاحباں کے بول اور آہنگ آج بھی خون کھولانے کے لئے شراب اور شباب کا کام کرتے ہیں۔ لیکن پنجاب کی گھنی چھاؤں اور اس کے جمال کا نقشہ ہی اور ہے۔

رزم کی جگہ پنجاب کی بزم کو دیکھیں تو یہاں اس کے پانچ دریاؤں کی طرح پانچ پیروں کے فیض کے چشمے بہتے نظر آتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ ' حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ ' حضرت میاں میرؒ اور امام بری لطیفؒ وہ بزرگانِ دین ہیں جنھوں نے اس سرزمین میں اسلام کی محبت ' مساوات اور رواداری کی تعلیم عام کی ـــــ آگے بڑھیں تو پانچ آبی دریاؤں اور پانچ روحانی دریاؤں کے پانیوں پر پلنے والے برگدوں اور پیپلوں کے نیچے پانچ صوفی شاعروں کی محفل سجی نظر آتی ہے جس میں شاہ حسینؒ ' سلطان باہوؒ ' وارث شاہؒ ' بُلھے شاہؒ اور خواجہ فریدؒ آمنے سامنے بیٹھے درد اور دوستی کے گیت سناتے پائے جاتے ہیں۔ یہ تھا وہ پنجاب جس کے شہر لاہور میں حضرت عباسؓ علمدار کی ہمشیرہ اور جناب مسلم بن عقیل کی زوجۂ محترمہ بی بی پاک دامن ' رقیہ بنت علی حیدر کرارؓ تبلیغ اسلام کے لئے تشریف لائیں اور یہیں دفن ہیں۔

یہ تھا وہ پنجاب میں نے جس میں آنکھ کھولی تھی۔

مہکتے میٹھے دریاؤں کے پانی ' تیز دھوپ اور گھنی چھاؤں والا میرا پنجاب جس کے ترنجنوں میں ہیروں ' سہتیوں ' سوہنیوں اور صاحباؤں نے اپنے اپنے چرخے ڈاہ رکھے تھے اور جن کے چرخوں کی گھوک سن کر بڑے بڑے رانجھے ' مراد ' مہینوال اور مرزے پہاڑوں سے اترے چلے آتے تھے۔

یہ تھا میرا پنجاب جس کے گبھروؤں اور مٹیاروں کے رنگ میں دہکتے لہو کی سرخی اور کچے دودھ کی سفیدی گندم گوں ہو گئی تھی۔

یہ تھا میرا پنجاب جہاں کے گبھرو کبڈی' کشتی اور گھڑ سواری میں تاک تھے اور جس کی مٹیاروں کی چال میں گِدّھا' کِکلی اور جُھمّر رچے تھے۔

یہ تھا میرا پنجاب جس کی ہواؤں میں ڈھولے ' ٹپّے اور ماہیا کے اشتیاق انگیز بول اور سُر سموئے ہوئے تھے۔

یہ تھا میرا پنجاب جہاں کیکروں پر کانٹے ہی نہیں پھول بھی آتے تھے اور جب یہ پھول پک جاتے تھے تو محبت کرنے والے کبھی نہ بچھڑنے کی قسمیں کھاتے تھے۔

یہ تھا میرا پنجاب جہاں گنّے کا رس نکالنے والے بیلنے سردیوں میں چوپالوں میں بدل جاتے اور اونچی لمبی ٹاہلیوں پر پڑی ہوئی پینگیں گرمیوں میں اندر سبھا کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔

یہ پنجاب اپنے دریاؤں کی طرح قدیم لیکن انہی کی طرح تازہ تھا۔

یہ وہ خطۂ ارض تھا جس کی سوان وادی میں انسانی وجود کے اولین نشانات ملتے ہیں۔ اسی سرزمین پر ہڑپہ کے نام سے دنیا کی سب سے پہلی انسانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔

یہ رِگ وید اور مہابھارت کی دھرتی تھی۔

یہ صرف بابر کے کلر کہار ' اکبر کے شاہی قلعے ' جہانگیر کے ہرن مینار ' شاہجہان کے شالیمار اور عالمگیر کی بادشاہی مسجد کا پنجاب نہ تھا' یہ لاکھوں بے گھر اور بے درمستانوں اور درویشوں کا ڈیرا تھا' یہ کروڑوں مزدوروں ' کسانوں ' مزارعوں ' تاجروں ' سوداگروں ' سپاہیوں ' کاریگروں اور محنت کشوں کا دیس تھا۔

کھیتوں اور کھلیانوں 'ہٹیوں اور بھٹیوں کا پنجاب

ہنستا گاتا پنجاب ' زندہ دل پنجاب ' دردمند پنجاب ' خدا شناس پنجاب۔

حالی ' اقبال ' تلوک چند محروم ' اختر شیرانی ' حفیظ جالندھری ' خوشی محمد ناظر ' غلام بھیک نیرنگ ' میراجی ' ن م راشد ' فیض احمد فیض ' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ' ساحر لدھیانوی ' مختار صدیقی ' قیوم نظر ' یوسف ظفر ' ضیاء جالندھری ' سیف الدین سیف ' مجید امجد ' ابن انشاء ' جگن ناتھ آزاد ' ظہیر کاشمیری ' قتیل شفائی ' صفدر میر ' ناصر کاظمی ' منیر نیازی ' شہزاد احمد ' غالب احمد ' احمد مشتاق ' کشور ناہید ' جاوید شاہین ' ذوالفقار احمد تابش ' شیر افضل جعفری ' ظفر اقبال ' اور حبیب جالب جیسے اردو شاعروں کا پنجاب۔

مولوی غلام رسول ' میاں محمد ' فضل شاہ ' ہاشم ' دائم ' مولا بخش کشتہ ' استاد کرم ' عشق لہر ' استاد دامن ' امرتا پریتم ' احمد راہی ' شریف کنجاہی اور فخر زماں جیسے پنجابی شاعروں کا پنجاب۔

محمد حسین آزاد ' مولانا ابوالکلام آزاد ' خلیفہ عبدالحکیم ' عطا اللہ شاہ بخاری ' چودھری افضل حق ' مولانا غلام مرشد ' محمد دین تاثیر ' مولانا صلاح الدین احمد ' پطرس بخاری ' شیخ محمد اکرام ' جسٹس شاہدین ہمایوں ' جسٹس ایس اے رحمان ' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ' غلام احمد پرویز ' علم الدین سالک ' عاشق حسین بٹالوی ' حمید احمد خان ' باری علیگ ' پروفیسر سراج الدین ' ڈاکٹر نذیر احمد ' غلام جیلانی برق ' پروفیسر اشفاق علی خان ' ڈاکٹر عبدالسلام ' ڈاکٹر جاوید اقبال ' الطاف گوہر ' ڈاکٹر مبشر حسن ' ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف ' پروفیسر شیخ محمود احمد ' پروفیسر محمد عثمان ' ڈاکٹر وحید قریشی ' مظفر علی سید ' وزیر آغا ' سید سبط الحسن ضیغم ' عابد حسن منٹو ' اور فتح محمد ملک جیسے عالموں ' ناقدوں اور دانشوروں کا پنجاب۔

امتیاز علی تاج ' حکیم احمد شجاع ' عابد علی عابد ' رفیع پیرزادہ ' بانو قدسیہ ' منو بھائی ' ڈاکٹر انور سجاد اور امجد اسلام امجد جیسے تمثیل نگاروں کا پنجاب۔

کرشن چندر ' سعادت حسن منٹو ' راجندر سنگھ بیدی ' احمد ندیم قاسمی ' بلونت سنگھ ' مرزا ادیب ' ایم اسلم ' نسیم حجازی ' قدرت اللہ شہاب ' ممتاز مفتی ' اشفاق احمد ' اعجاز حسین بٹالوی ' جمیلہ ہاشمی ' رضیہ بٹ ' صلاح الدین عادل ' انور غالب اور عبداللہ حسین جیسے ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کا پنجاب۔

ظفر علی خان ' سر عبدالقادر ' عبدالمجید سالک ' غلام رسول مہر ' حمید نظامی ' چراغ حسن حسرت ' فضل کریم خان درانی ' مرتضیٰ احمد خان میکش ' دیوان سنگھ مفتون ' میاں بشیر احمد ' حکیم یوسف حسن ' شورش کاشمیری ' عبداللہ بٹ ' مجید لاہوری ' اے۔ ٹی۔ چودھری ' عبداللہ ملک ' مظہر علی خان ' ظہیر

بابر ' احمد بشیر' شفقت تنویر مرزا' سید امجد حسین ' انتظار حسین ' م۔ ش۔ ' ظہور عالم شہید 'مجید نظامی ' زیڈ۔ اے۔ سلہری ' میر خلیل الرحمٰن ' عبدالسلام خورشید' محمد طفیل ' کوثر نیازی ' وقار انبالوی ' بشیر ارشد ' وارث میر' نثار عثمانی ' حسین نقی ' مجیب الرحمٰن شامی ' عبدالقادر حسن ' عبدالقدیر رشک ' ارشاد احمد حقانی ' ضیاء شاہد ' نذیر ناجی ' اثر چوہان ' طارق اسمٰعیل' انور قدوائی ' زاہد ملک ' اسد اللہ غالب اور شورش ملک جیسے مدیروں اور صحافیوں کا پنجاب۔

حاجی لق لق' کنھیا لال کپور' شفیق الرحمٰن 'ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان جیسے مزاح نگاروں کا پنجاب۔

عبدالرحمٰن چغتائی ' استاد الہ بخش 'امرتا شیر گل ' زوبی ' زبیدہ آغا' معین نجمی ' احمد پرویز' شمزہ ' خالد اقبال' غلام رسول' انور دل' موجد اور اسلم کمال جیسے مصوروں کا پنجاب۔

عبدالمجید پرویں رقم' تاج الدین زریں رقم' محمد صدیق الماس رقم' حافظ یوسف سدیدی ' سید انور حسین نفیس رقم' استاد محترم محمد حسین شاہ' عبدالواحد نادر القلم اور شریف گلزار جیسے خوش نویسوں کا پنجاب۔

یہ تھا میرا پنجاب جس کے شہر الہ موسیٰ میں ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم رہتی تھیں۔ جس کے شہر قصور نے استاد بڑے غلام علی خان اور استاد برکت علی خان کے علاوہ ملکۂ ترنم نور جہاں کو جنم دیا تھا۔ جس کے شہر ملتان میں اقبال بانو اور ثریا ملتانیکر اور شہر لاہور میں شمشاد بیگم 'نسیم بیگم اور ملکہ پکھراج دلوں کے تار چھیڑتی تھیں۔ جس کی فضاؤں میں ملکۂ غزل فریدہ خانم کی مدھ بھری تانیں گندھی تھیں۔ جہاں استاد اللہ رکھا اور استاد شوکت حسین نے طبلے کا جادو جگایا تھا۔ جہاں شریف خان پونچھ والے کی ستار نے دل کے شعلے کو زبان دی تھی۔ جس کے سینے سے شام چوراسی اور پٹیالے کی گائیکی اگی تھی۔ جہاں استاد فتح علی خان 'استاد امانت علی خان اور استاد سلامت علی خان جیسے باکمال صدا کار بستے تھے۔ جس کے شہروں نے سہگل اور خورشید کی آوازوں کو اپنی دلکشی دی تھی۔ جس کے صحراؤں نے ریشماں کی ہوکوں اور کوکوں میں اپنی آندھیوں اور بگولوں کا زور بھر دیا تھا جس کے میٹھے چشموں سے مہدی حسن اور غلام علی کی غزل پھوٹی تھی 'جس کے تپتے میدانوں اور تھلوں نے عالم لوہار 'طفیل نیازی ' عنایت حسین بھٹی ' شوکت علی اور عطاء اللہ نیازی کے لوک رنگ کو گداز بخشا تھا۔

یہ تھا میرا پنجاب جس میں زندگی کا سفر شروع کیا تو اس کے پانیوں میں محبت کی چاشنی پائی ' جہاں

جوان ہوا تو اس کی دھوپ میں محبت کی چمک دیکھی اور اب جہاں زندگی کی شام آئی ہے تو اس کی چھاؤں میں محبت کی نرمی محسوس کرتا ہوں۔ میں نے ایک عمر اس پنجاب کے شہروں ' قصبوں ' دیہوں ' گلی محلوں اور بازاروں میں انسانوں کو محبت اور رواداری سے جیتے دیکھا ہے۔ فسادات سے پہلے میرے اپنے گاؤں میں مسلمان اور سکھ بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہتے تھے۔ ایک سکھ خاندان ہمارا مزارع تھا۔ چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو انہی لوگوں کا دوہا ہوا دودھ پیتا اور انہی کی پکائی ہوئی روٹی کھاتا۔

اس محبت اور رواداری کو میں آج بھی اپنے وجود کے ریزے ریزے میں موجزن پاتا ہوں اور میرے وجود کا ریزہ ریزہ جانتا ہے کہ محبت اور رواداری صرف اور صرف شجاع اور بہادر لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

یہ محبت اور رواداری ' یہ شجاعت اور بہادری پنجاب کے مزاج کا بنیادی اور لازمی جز ہے۔ یہ محبت اور رواداری ' یہ شجاعت اور بہادری پنجاب کی روح ' اس کی حقیقت ' اُس کا اصل کردار ہے۔ لیکن یہ محبت اور رواداری ' یہ شجاعت اور دلیری دوسروں کو نظر نہیں آتی۔

پنجاب خوبصورت ہے ' طرح دار ہے ' انسان دوست ہے ' ملنسار ہے ' ہنرمند ہے ' خوددار ہے ' سخی ہے ' دلدار ہے لیکن وہ دوسروں کو ایسا نظر نہیں آتا بہر حال مجھے تو وہ ایسا ہی ملا تھا۔ اپنے من میں ڈوب کر اس کا سراغ پانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ مجھے ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ من سے باہر پھیلے آفاق پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس کے یہی خط و خال ابھرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں ' جب تک دوسروں کو اس کی یہ شکل نظر نہیں آتی ' کون میرا یقین کرے گا۔

مجھے دوسروں کے لئے پنجاب کی تلاش ہے۔ مگر یہ دوسرے کون ہیں؟ میرے سندھی ' پٹھان اور بلوچ بھائی؟

ہاں ' لیکن ان سے بھی زیادہ خود پنجابیوں کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچانیں۔ اگر انہوں نے اپنی پہچان کر لی ' اپنی شناخت کر لی ' اپنی تلاش کر لی ' اپنی دریافت کر لی تو پھر تاریخ کے آسمان پر ایک نیا پنجاب طلوع ہوگا اور پاکستان کے چاروں صوبوں میں بسنے والے عوام کا ایک دوسرے سے از سر نو تعارف ہوگا اور یہ تعارف اس دوستی کی بنیاد بنے گا جس سے اس ملک کے دس کروڑ عوام آج تک محروم چلے آتے ہیں۔

دوسرا باب

پنجاب اور پاکستان

اس وقت پاکستان کے چار صوبے ہیں۔ ان میں صرف پنجاب ایسا ہے جو ۱۹۴۷ء میں دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ اس کا ایک حصہ بھارت میں رہ گیا اور دوسرا پاکستان میں شامل ہوا۔ اس کے برعکس سندھ، سرحد اور بلوچستان جیسے انگریز کے وقت میں تھے ویسے ہی قیامِ پاکستان کے وقت برقرار رہے اور ایسے ہی آج بھی ہیں۔ یہ تینوں صوبے نہ صرف تقسیم نہ ہوئے بلکہ ان کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں بھی قیامِ پاکستان سے کوئی خاص ہل چل اور اُکھاڑ پچھاڑ واقع نہ ہوئی۔ بے شک مہاجرین کی آباد کاری کی حد تک سندھ ضرور متاثر ہوا لیکن جس طرح پنجاب کی تقسیم نے اس کی زمین کو اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کی لاشوں سے پاٹ دیا اور اس کے دریاؤں کے پانیوں کو ان کے خون سے سرخ کر دیا خدا کا شکر ہے کہ ایسا سندھ میں نہیں ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا نہ صرف پاکستان کے کسی دوسرے صوبے میں نہیں ہوا بلکہ بھارت میں بھی صرف مشرقی پنجاب ہی میں ہوا، کہیں اور نہیں ہوا۔

اسی پر تو پنجاب کی ایک بیٹی امرتا پریتم نے حضرت وارث شاہ سے فریاد کی تھی ——

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

اُٹھ ورد منداں دیا دردیا' تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں' لہو دی بھری چناب

تقسیم سے پہلے پورے پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت ضرور حاصل تھی لیکن زیادہ نہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور سکھ بھی یہاں بڑی تعداد میں آباد تھے۔ تقسیم کے بعد پاک پنجاب خالص مسلمان آبادی کا علاقہ بن گیا اور اس کے دیہوں 'قصبوں اور شہروں کا نقشہ اور اس کے گلی محلوں 'بازاروں' دکانوں' دفتروں اور محکموں کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ تبدیلی کا یہ احساس پنجاب کے بچے بچے کے قلب و نظر میں رچ گیا' پنجاب کے بچے بچے کو پتا چل گیا کہ زندگی بدل گئی ہے' وقت بدل گیا ہے' ماحول بدل گیا ہے' حالات بدل گئے ہیں۔

مجھے یاد ہے' جس روز پاکستان بنا تھا لاہور کا آسمان سرخ تھا اور اس سے دہکتی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ شہر کیا تھا ایک شمشان تھا جس میں مردہ لاشوں کی جگہ زندہ انسان جل رہے تھے۔ فضا میں اس قدر کثیف دھواں تھا کہ سانس لینا دوبھر تھا۔ جلتے جسموں کی بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ دل پر دہشت کا پہرہ تھا۔ گھر میں میری ماں' چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کے سوا کوئی نہ تھا۔ میرے میاں جی اور تینوں بڑے بھائی پاکستان میں قائداعظم کی تشریف آوری کا منظر دیکھنے اور استقبالیہ جلوس میں شرکت کے لئے کراچی گئے ہوئے تھے۔

اس وقت میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف اے کا طالب علم، مسلم لیگ کا ایک ادنیٰ کارکن اور قائداعظم کا ایک گمنام سپاہی تھا۔ شباب مفتی مرحوم 'نسیم انور بیگ 'تجمل حسین' احسان الحق ڈار' منظر بشیر حمید اصغر' آفتاب فرخ اور میں گورنمنٹ کالج لاہور کے سخت ڈسپلن کے باوجود "لے کے رہیں گے پاکستان" کی رٹ لگائے رکھتے تھے۔ "پاکستان' اے نیشن" کے مصنف اور انگریزی کے پروفیسر اشفاق علی خان جو اُن دنوں الحمزہ کے قلمی نام سے اخباری اور علمی دنیا میں پاکستان کی بھرپور حمایت کرتے تھے اور پنجابی شاعری کے عاشق اور حیوانیات کے پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد ہم کارکنوں کے درپردہ گورو تھے۔ ہم لوگ وقتاً فوقتاً جلوس نکالنے اور سول سیکرٹریٹ کے سامنے سڑک روک کر نماز پڑھنے جیسی جسارتوں کی پاداش میں آئے دن پکڑے جاتے اور چھُٹتے رہتے تھے۔ پولیس ہمیں اپنی لاریوں میں لاد کر اکثر شہر سے دور لے جاتی اور ویرانوں میں اتار دیتی یا پھر تھانہ سول لائنز کی حوالات میں بند کر دیتی تھی۔ لیکن جب فسادات شروع ہوئے تو اکثر طالب علم اور کارکن ایک دوسرے سے کٹ کر جیلوں میں یا اپنے اپنے علاقوں میں پابند ہو کر رہ گئے۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو رمضان المبارک کی ۲۷ تاریخ تھی جو بہ یک وقت جمعتہ الوداع اور لیلتہ القدر کے مبارک ترین لمحات پر محیط تھی۔ اس رات میں اپنی فکر مندماں کی ناراضی مول لے کر، تراویح کی نماز پڑھنے اندرون بھاٹی گیٹ کی اونچی مسجد میں گیا تھا۔ وہ خضوع و خشوع، وہ جوش و خروش، وہ امیدیں اور آرزوئیں، وہ فریادیں اور دعائیں مجھے آج بھی یاد ہیں جو اس رات میرے وجود میں موجزن تھیں۔ میرے بدن کے ایک ایک رونگٹے، میرے دماغ کے ایک ایک خلیئے، میرے دل کے ایک ایک گوشے اور میری روح کے ایک ایک ارتعاش میں یہ خبر پہاڑوں میں گھری ہوئی وادیوں سے اٹھنے والی اذانوں کی طرح گونج رہی تھی کہ پاکستان بن گیا ہے۔

پاک پنجاب میں بسنے والے قریب قریب ہر مرد، عورت، بچے، جوان اور بوڑھے کی یہی حالت اور واردات تھی۔ اور ان سے بھی زیادہ یہ حالت اور واردات ان لاکھوں مہاجرین کی تھی جو مشرقی پنجاب سے نہ صرف مالی اور سماجی طور پر لٹ پٹ کر بلکہ جسمانی اور جانی طور پر کٹ پھٹ کر یہاں پہنچ رہے تھے۔ موت اور محرومی کے مہیب سایوں میں میلوں میل پیدل سفر کرتے ہوئے جب وہ پاک پنجاب کی حدود میں داخل ہوتے تو اسے پنجاب کی نہیں پاکستان کی مٹی سمجھ کر چومتے اور آنکھوں سے لگاتے تھے۔ اس مٹی کی خوشبو انہیں ایک نئے سویرے کی نوید دیتی اور ایک نئی زندگی کی ڈھارس بندھاتی تھی۔

پاکستان بے شک پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے مسلمان عوام کی تائید اور جمہوری عمل سے بنا تھا بلکہ اس کی تعمیر میں پورے برصغیر کے مسلمانوں کی قربانیاں اور کوششیں شامل تھیں۔ اور اس ضمن میں وہ مسلمان خصوصاً قابل ذکر ہیں جنھیں بخوبی علم تھا کہ ان کے اقلیتی صوبے یا علاقے پاکستان کا حصہ نہ بنیں گے مگر انہوں نے پھر بھی نہ صرف اس کے قیام کے لئے ووٹ دیئے بلکہ ہندو اکثریت کی مستقل دشمنی مول لے لی تھی۔ اس سب کے باوجود جو مالی اور سماجی، جسمانی اور جانی نقصان پنجاب میں ہُوا اس کا عشرِ عشیر بھی پورے برصغیر میں کہیں اور نہیں ہُوا۔ اگر پنجاب کے نقصان کی کوئی قابلِ ذکر مثال ملتی ہے تو بنگال میں۔ لیکن جو "ہونی" پنجاب کے عوام پر ٹوٹی، بنگال کے عوام بڑی حد تک اس سے محفوظ رہے کیونکہ وہاں اتنے وسیع پیمانے پر آبادیوں کی ہجرت نہ ہوئی تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب اور بنگال دونوں ہی تقسیم ہوئے تھے لیکن جس پیمانے پر پنجابیوں کا جانی نقصان ہُوا، بنگالیوں کا نہ ہُوا تھا۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پنجاب میں رہنے والے ہر شخص نے اپنے خون، اپنے حواس، اپنے دل و

دماغ، اپنی روح اور اپنے وجود میں ایک بات جان لی تھی کہ کرۂ ارض پر آج پاکستان کی صورت میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست ابھر آئی ہے۔ اس نے جان لیا تھا کہ آج پاکستان کی صورت میں آبادی کے لحاظ سے دنیا کے پانچویں سب سے بڑے ملک نے جنم لے لیا ہے جس شدومد کے ساتھ یہ خبر پنجاب کے عوام تک پہنچی تھی، دوسرے صوبوں کے باسیوں تک نہ گئی تھی۔ یوں بھی اقبال کے پنجاب کے لئے جداگانہ قومیت کے مقابلے میں "نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر" پھیلی ہوئی ملت کا تصور زیادہ جاذبیت رکھتا تھا اور وہ چھوٹی اکائیوں کے بجائے بڑی اکائیوں میں سوچنے لگے تھے۔ لیکن پاکستان کے ساتھ پنجاب کے تعلق کا مسئلہ یہیں تک محدود نہیں۔ اور اس سلسلے میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ خصوصی توجہ چاہتی ہے۔

پنجاب میں پاکستان بن جانے کا احساس اس لئے اس قدر شدید اور گہرا تھا کہ خود اس کے اپنے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور اس کا اپنا آپ قائم نہ رہا تھا۔ اپنا وجود اور اپنی وحدت گنوا کر پنجاب نے پاکستان کی صورت میں ایک عظیم تر وجود اور ایک عظیم تر وحدت کو منزل اور مقصود بنا لیا تھا۔ جب پنجاب نے اپنے آپ کو دونیم، زخمی اور لہولہان پایا تو اس نے پاکستان کے تشخص میں اپنا تشخص گم کر کے اپنی کمی اور کمزوری اور اپنے ادھورے پن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس نے نفسیاتی سطح پر مفید سمجھا کہ پنجابی بننے اور کہلانے کے بجائے پاکستانی بن جائے، پاکستانی کہلائے اور یوں اپنے تباہ و برباد ہو جانے کے تکلیف دہ احساس سے چھٹکارا پالے۔

مجھے احساس ہے کہ بعد میں جاگیردار طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض پنجابی قائدین نے پاکستان کے وجود میں اپنے وجود کو گم کر دینے کے پنجابی رویئے کو ایک ہتھیار کے طور پر دانستہ استعمال کیا اور دوسرے صوبوں کو پنجابی عوام سے بدظن کرنے کی گراں قیمت پر ذاتی اور طبقاتی مفادات حاصل کئے لیکن ابتداء میں یہ رویہ پنجاب کے عوام نے نادانستہ اور غیر شعوری طور پر ہی اپنایا تھا اور اس کی حقیقت محض یہ تھی کہ وہ اپنے ٹوٹ پھوٹ جانے کے دکھ بھرے تجربے کو کسی بڑی حقیقت کیساتھ جڑ کر بھلا دینا چاہتے تھے۔

پاکستان میں پنجاب کا مقام متعین کرنے کے سلسلے میں دو باتیں اور قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ برطانوی دورِ تسلط سے پہلے اور بعد میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں مختلف وجوہات کے باعث اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے زیادہ ترقی ہوئی تھی اور بعض میں کم۔ چنانچہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں مثلاً بمبئی، مدراس اور کلکتہ کے آس پاس صنعت و حرفت کی، اور یوپی اور پنجاب میں تعلیم کی

نسبتاً زیادہ نشو و نما ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں سے پہلے پنجاب میں شرح خواندگی بعد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے پنجابی کے بجائے اردو کو ذریعۂ تعلیم مقرر کر دیا تھا اور بے شمار پنجابی مدرسے بند ہو گئے تھے۔ بہر حال تعلیم کے لحاظ سے پنجاب کو کسی نہ کسی حد تک بعد میں بھی امتیاز حاصل رہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان میں پنجابیوں نے فرداً فرداً تو خاصی ترقی کی لیکن انہوں نے یہ ترقی پنجابی بن کر نہیں پاکستانی بن کر کی بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی انفرادی ترقی کی قیمت پنجاب کو ادا کرنی پڑی۔ پنجاب کے صوبے اور پنجاب کے پانچ کروڑ عوام نے انفرادی طور پر ترقی کرنے والے مٹھی بھر پنجابیوں کی خاطر قیام پاکستان سے لے کر اب تک صرف گالیاں ہی کھائی ہیں، پنجاب نے اور پنجابی عوام نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔

ضمناً یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ پاکستان بننے سے قبل بڑی مدت تک پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم پنجاب کہا جاتا رہا ہے کیونکہ ہندوستان میں پنجاب کی سیاسی اور فوجی اہمیت کا یہی تقاضا تھا۔ خود تحریکِ پاکستان میں پنجاب کو پاکستان کا بازوئے شمشیر زن گردانا جاتا تھا۔ سکندر جناح پیکٹ کی تفصیل میں جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی سیاست میں بھی پنجابی مسلمانوں کو ایک گونہ "صوبائی خود مختاری" حاصل تھی چنانچہ وہ قومی سطح پر مسلم لیگ کا اور صوبائی سطح پر یونینسٹ پارٹی کا ساتھ دینے کا اختیار رکھتے تھے۔

آیئے، ان بحثوں کو کچھ دیر ایک طرف رکھ کر یہ دیکھیں کہ بظاہر صورت حال کیا ہے اور اسے برپا کرنے میں کن عوامل نے حصہ لیا ہے۔

پاکستان بنا تو پنجاب اکثریتی صوبہ نہ تھا۔ یہ شرف مشرقی بنگال کو حاصل تھا۔ لیکن پاکستان کے منظر و پس منظر میں پنجاب کی اہمیت کئی اعتبار سے اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اس نوزائیدہ ملک میں روز بہ روز نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ دوسروں کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ اوپر سے پنجاب نے اپنے تشخص کو اس حد تک پاکستان کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا کہ پاکستان کی حدود میں غیر معمولی طور پر نمایاں نظر آنے میں اس نے نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہ سمجھا بلکہ اس ضمن میں وہ آگے بڑھ کر کوشش کرنے لگا۔ نتیجہ؟ "رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی" کے مصداق پاکستان پاکستان کرتا پنجاب آپے پاکستان بن گیا! اور یوں اس کے ذہن سے اپنی شناخت اور اپنی پہچان جاتی رہی۔

پنجابیوں نے پاکستانی قومیت کے تصور میں اپنی پنجابیت کی حقیقت کو اس حد تک جذب کر دیا کہ پنجابی کہلانا اور اس نسبت سے پہچانے جانا ان کے لئے کوئی فخر کی بات نہ رہ گئی۔ انگریز نے پنجاب کے جذبۂ مزاحمت کو کچلنے کے لئے پنجابی زبان کے بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا تھا۔ اُس بھیّا فوج اور بھیّا نوکر شاہی نے جو انگریز کے ساتھ پنجاب کو فتح کرنے آئی تھی اپنی سہولت کی خاطر اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لئے خصوصی زور لگایا تھا۔ انگریز کی ضرورت اور بھیا فوج اور بھیّا نوکر شاہی کی سہولت نے پنجاب کی ثقافت پر کاری ضرب لگائی۔ زبان ہی ثقافت کی جان ہوتی ہے۔ زبان نہ رہی تو ثقافت کی عمارت بوسیدہ ہو کر گرنے لگی۔ ستم بالائے ستم ' تحریک پاکستان میں اردو کے حق میں بلند ہونے والے ایک نعرے کو پنجابیوں نے اس حد تک اپنایا کہ وہ اپنی ثقافت کی بنیاد ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ "اردو بولو ' اردو پڑھو ' اردو لکھو" کا قول گھروں اور دفتروں میں ان کا عمل بن گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کی عظیم شاعری اس کے باسیوں کے لئے یونانی اور عبرانی بن گئی۔ آج پنجاب کی نئی نسلیں شاید ہی حضرت وارث شاہ کی ہیر' مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا یا میاں محمد بخش کی سیف الملوک کو خود پڑھ یا سمجھ سکتی ہوں چہ جائیکہ توقع کی جائے کہ انہیں اپنے شعری ورثے کا کچھ نہ کچھ حصہ زبانی یاد ہو گا یا یہ ورثہ ان کے خواب و خیال کا سرچشمہ بن پائے گا۔

یہی کیفیت پنجاب کے رہن سہن کی ہے۔ وہ چوپال اور پنچایتیں ' وہ پنگھٹ ' ترنجن اور پینگیں ' وہ رنگین چارپائیاں ' پیڑھیاں پیڑھے اور موڑھے ' وہ منقش چادریں اور پھلکاریاں ' وہ چھاپے کی رضائیاں ' دلائیاں اور تندوریاں ' وہ جڑاؤ گلوبند ' تعویذ ' نتھیں اور لونگ ' وہ لسی ' رس ' شربت اور سردئی ' وہ سرسوں کا ساگ اور مکھن کے پیڑے ' وہ مسی روٹیاں ' قیمے کے نان اور بلوں والے پراٹھے ' وہ میٹھے چاول اور نمکین کھچڑی ' وہ ہولاں ' پھلے ' کھیلاں اور مرونڈے ' وہ اندرسے ' کلچے ' قتلمے اور پٹھورے ' وہ منھیاں ' باقر خانیاں ' پھینیاں اور ختائیاں ' وہ لنگیاں ' پٹکے اور لاچے ' وہ ناگرہ جوتیاں اور طلائی کھسے ' وہ کھیس ' سلوکے ' لوئیاں اور دُھسے —— سب ایک طرف رہ گئے اور ارد گرد کا بے ربط رہن سہن پنجاب پر مسلط ہو گیا۔ بس کچھ پہناوا بچ گیا! وہ بھی دوسروں کی بدولت۔ اگر شلوار قمیص اور شلوار کرتا دوسرے صوبوں میں نہ پہنا جاتا تو ممکن ہے وہ بھی پنجاب کے شہروں اور قصبوں سے غائب ہو جاتا۔

پاکستان کے ساتھ رومانوی یکجہتی اور اپنے تشخص ' شناخت اور پہچان کو مٹا کر پاکستان کے حوالے سے پہچانے جانے کی ایک غیر حقیقت پسندانہ خواہش کے باعث جو پنجابیوں نے پاگل پن کی

حد تک اپنالی تھی دو بڑی خرابیاں واقع ہو گئیں۔ ایک یہ کہ پنجابیوں نے پنجاب ہی کو پاکستان سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسری یہ کہ غیر پنجابیوں نے پاکستان کو پنجاب کا نام دے دیا۔ اس صورت حال کو دوسرے صوبوں نے کس نظر سے دیکھا' یہ جاننے کے لئے ذرا سرحد کے خان عبدالولی خان کے نام بلوچستان کے سردار عطاء اللہ مینگل کا وہ کھلا خط ملاحظہ کر لیجئے جو عبدالولی خان صاحب کے ۲۳ مارچ ۱۹۸۳ء کے بیان کے جواب میں روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوا تھا اور جس کے اختتام پر مینگل صاحب نے کہا تھا:

> "ولی! مجھ سے آزادی کے مقدس نام کی قسم لے لو' جس کو "پاکستان" کہا جا رہا ہے وہ "عظیم تر پنجاب" کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

اسی خط میں قبل ازیں وہ یہ کہہ چکے تھے:

> "ولی! سچ بتاؤ' تمہیں قسم ہے بادشاہ خان کی پشتون دوستی کی' کیا "عظیم تر پنجاب" کے ساتھ اب ہم لوگوں کا گزارا ممکن ہے؟ کیا اس سے بھی زیادہ تلخ تجربے درکار ہیں؟ ممکن ہے کہ آپ کے ہاں صورت حال اس قدر سنگین نہ ہو لیکن سندھ اور بلوچستان میں جس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور جس تیزی سے مقامی آبادی کو اقلیت میں بدلنے کی کارروائیاں کی جا رہی ہیں اس نے ہمارے لئے صرف دو راستے کھلے چھوڑے ہیں۔ یا تو ہم اپنے قومی تشخص سے دست بردار ہو جائیں یا پھر "آزادی یا موت" کو شرط اور شعار بنا کر "عظیم تر پنجاب" سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں۔"

مختصر یہ کہ پاکستان کے سلسلے میں پنجاب کے رومانوی اور غیر حقیقت پسندانہ رویئے کو دوسرے صوبوں نے اس کی غلبہ پسندی پر محمول کیا۔ اپنی زبان اور رہن سہن کو ترک کر کے جب پنجابیوں نے فوج' سول ملازمتوں' معیشت' صحافت اور تعلیم کے دائروں میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تو دوسروں نے اسے اس کی موقع پرستی' جارحیت اور استحصال ہی قرار دیا۔

پنجاب کو فوج میں شروع ہی سے اکثریت حاصل تھی۔ حقیقت میں یہ اکثریت نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند کے پس منظر میں تھی۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ ابتداء میں انڈین نیشنل کانگریس نے برطانیہ سے مکمل آزادی کے بجائے صرف ڈومینین بنائے جانے (-DOMI

NION STATUS) کا مطالبہ کیا تھا جب کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ بلند ہُوا تھا۔ اور تو اور مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار "ہری جن" میں وضاحت کی تھی کہ ہندوستانی فوجوں میں پنجابی مسلمانوں کی اس قدر اکثریت ہے کہ اگر ہندوستان متحدہ حالت میں آزاد ہو گیا تو یہ فوج پورے ہندوستان پر قبضہ کر کے اسے ایک مسلم ریاست میں تبدیل کر دے گی۔ یاد رہے کہ جب دوسری جنگ عظیم کے دوران گاندھی جی کے سیاسی رقیب سبھاش چندر بوس اور پنجابی جرنیلوں شاہ نواز اور موہن سنگھ نے آزاد ہند فوج کے نام سے باغی فوج بنائی تو اس کے اسّی فیصد سے زیادہ ارکان پنجاب کے مسلمان اور سکھ سپاہی تھے۔

بہر حال قیام پاکستان کے وقت دوسرے محکموں کی طرح فوج بھی تقسیم ہوئی تو پاکستانی فوج میں پنجابیوں کی بھاری اکثریت تھی۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے مشرقی بنگال کا اس میں بہت ہی کم حصہ تھا۔ سندھ اور بلوچستان کے پرانے باشندے تو پاکستانی فوج میں شامل نہ تھے البتہ ان صوبوں میں آباد اردو بولنے والے مہاجرین اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ جہاں تک سرحد کا تعلق ہے اسے فوج میں پوری پوری نمائندگی حاصل تھی اور گو اس کی نمائندگی تناسب کے اعتبار سے پنجاب کے مقابلے میں زیادہ تھی لیکن پنجاب کی آبادی سرحد سے دگنی تگنی چلی آتی ہے اس لئے عددی طور پر فوج میں پٹھانوں کی بنسبت پنجابی کہیں زیادہ تھے۔ یہی صورت حال آج بھی قائم ہے۔ آج بھی ہماری فوج زیادہ تر پنجاب اور وافر تعداد میں سرحد سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ فوج کے دروازے چاروں صوبوں کے باشندوں کے لئے یکساں کھلے تھے اور سندھ اور بلوچستان نے خود بھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ فوج کے کرتا دھرتا ایسے لوگ تھے جنھوں نے ان دو صوبوں کے لوگوں کو فوج میں مناسب نمائندگی دینے کے لئے نہ تو قابلِ عمل طریقے سوچے اور نہ مقبولِ عام راہیں تراشیں۔

پنجاب کے کچھ اضلاع مثلاً میانوالی، اٹک، راولپنڈی، جہلم اور گجرات تو روایتی طور پر بھرتی کا علاقہ تھے ہی، پاکستان بننے کے بعد اس علاقے سے باہر کے پنجابیوں نے بھی فوج میں شمولیت کو اپنے لئے باعثِ فخر اور خدمتِ ملک کا قابلِ قدر ذریعہ سمجھا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستانی فوج دوسرے صوبوں کے لوگوں کے نزدیک پنجابی فوج بنتی چلی گئی۔

پنجاب کو نہ تو اس بات پر کوئی اختیار حاصل تھا کہ اس کی آبادی اس قدر زیادہ ہے اور نہ اس بات پر کہ یہ آبادی اپنے اندر محنت کرنے، ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک شعبے سے دوسرے

شعبے میں منتقل ہو کر نئے سے نیا کام سیکھنے اور کر گزرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ پنجاب کی اس صفت نے اسے چھوٹی سے چھوٹی نوکری سے لے کر اونچی سے اونچی ملازمت میں تعداد اور معیار کے لحاظ سے ممتاز کر دیا۔ کام کے تنوع کے سلسلے میں یہ لچک اور نقل مکانی کے سلسلے میں یہ آمادگی اگر پنجابیوں کے علاوہ کسی میں تھی تو پٹھانوں میں جو فوج اور ٹرانسپورٹ میں دلچسپی کے باعث گھروں سے دور آتے جاتے رہتے تھے۔ گو بنگالیوں اور بلوچوں کو بھی نقل و حرکت سے خاصی عار تھی لیکن سندھ کے مسلمانوں کا مقام اس سلسلے میں بہت اونچا تھا۔ اگر کسی مسلمان سندھی اہلکار کا تبادلہ اس کے گاؤں سے ساتھ والے گاؤں ہو جاتا تھا تو اس کے گھر میں باقاعدہ صفِ ماتم بچھ جاتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ پردیس جا رہا ہے۔ وہ عقیدے کی حد تک قائل تھے کہ دریا کو عبور کرنا اور سمندر کا سفر اختیار کرنا ان کے لئے نامبارک ہے۔

ملازمتوں یا نوکر شاہی کے سلسلے میں ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ قیام پاکستان کے وقت لاکھوں مسلمان اہل کار اُن صوبوں سے پاکستان چلے آئے تھے جو ہندوستان میں رہ گئے۔ خاص طور پر یوپی کے اردو بولنے والے اہل کاروں کی اس قدر بہتات تھی کہ مشرقی بنگال تک میں انہیں تعینات کرنا پڑا تھا۔ نوکر شاہی کے روایتی رویوں کی بنیاد پاکستان میں انہی اہل کاروں نے رکھی تھی جنہیں اردو زبان کے ناتے بعد میں پنجابی اہل کاروں نے بھی اپنا لیا۔ بہرحال ' وقت کے ساتھ ساتھ پنجاب نے اپنی آبادی کے اعتبار سے ملازمتوں میں اپنا حصہ بٹانا شروع کر دیا۔ چونکہ مہاجر اور پنجابی اہل کار۔ دونوں اردو بولتے تھے اس لئے اردو بولنے والا ہر اہل کار دوسرے صوبوں کے عوام کی نظر میں پنجابی قرار پا گیا اور یوں فوج کی طرح نوکر شاہی کو بھی پاکستان کے بجائے پنجاب سے منسوب کر دیا گیا۔

یہی صورت حال زراعت اور صنعت کے میدانوں میں سامنے آئی۔ ہر جگہ جا کر رزق کمانے کے لئے آمادہ ' مشکل سے مشکل کام کرنے پر تیار اور ہر طرح کے مقام پر اور ہر طرح کے کام میں درپیش حالات کا سامنا کر گزرنے والے پنجابیوں نے نہ صرف اپنے صوبے میں زراعت کو ترقی دی بلکہ سندھ اور بلوچستان میں جا جا کر وہاں کے کنوارے کھیتوں میں بھی ہل جوت دیئے۔

صنعت کے دائرے میں بھی پنجابی اسی طرح آگے بڑھے۔ جہاں انہوں نے فیصل آباد میں کپڑے کی صنعت قائم کی وہاں پنجابی سرمایہ کاروں نے کراچی میں بھی کارخانے لگانے شروع کر دیئے۔ آج اگر سندھ ' خصوصاً کراچی میں پورے پاکستان کی ستر سے پچھتر فیصد صنعت مرکوز ہے تو

اس میں پنجاب کے سرمایہ کار کا بھی بہت حصہ اور ہاتھ ہے۔ بے شک بھارت سے اردو بولنے والے سوداگروں اور میمن' بوہرہ برادریوں نے آکر کراچی میں کچھ روپیہ لگایا لیکن آج پاکستان کے بڑے بڑے سرمایہ کاروں کی صف میں پنجابی خصوصاً چنیوٹی سرمایہ کاروں نے اس حد تک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے کہ کئی سرکردہ میمن اور بوہرہ سیٹھ بھی ان کی طرف رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔

اب ذرا بظاہر ایک چھوٹے دائرے پر نظر ڈالئے۔ صحافت کے میدان میں تحریک پاکستان کے دوران مرحوم الطاف حسین کے روزنامہ "ڈان" کو چھوڑ کر جن اخبارات نے نمایاں حیثیت اختیار کی وہ سب کے سب پنجاب سے نکلتے تھے۔ میاں افتخار الدین کے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کے علاوہ مرحوم حمید نظامی کے "نوائے وقت" نے قیام پاکستان کے آس پاس مسلمان عوام میں خصوصی مقام حاصل کر لیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک اور پنجابی میر خلیل الرحمٰن دہلی سے اپنا اخبار "جنگ" کراچی لے آئے۔ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" تو بعد میں نیشنل پریس ٹرسٹ کی نذر ہو گئے لیکن "نوائے وقت" اور "جنگ" بچے رہے۔ آج بھی یہ دونوں اخبار الگ الگ مزاج رکھنے کے باوجود پاکستان کے آزاد اخبارات میں سب سے زیادہ موثر ہیں۔ صحافت میں "جنگ" اپنی وسیع المشربی اور خبریت کے باعث کاروباری کامیابی کا نشان بن چکا ہے۔ "جنگ" کی یہ کامیابی غیر پنجابی صحافیوں اور اخباری اداروں کے لئے خاص خوشی کا باعث نہیں۔ دوسری طرف "نوائے وقت" نے پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ کا کردار سنبھال رکھا ہے۔ اس کے غیر پنجابی ناقدین کی رائے ہے کہ یہ اخبار اس ضمن میں اس قدر متشدد ہے کہ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے جوش میں اکثر اوقات اسے ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا ہوش نہیں رہتا۔ بہر حال رائے عامہ بنانے اور بگاڑنے میں آج پنجابی ملکیت کے یہ دو آزاد اخبار جتنی اہمیت رکھتے ہیں' دوسرے تمام اخبارات مل کر بھی نہیں رکھتے۔ پنجاب سے باہر کے مہربان اسے بھی پنجابی غلبہ ہی گردانتے ہیں۔

آخر میں تعلیم کے شعبے کا جائزہ لے لیں۔ قیام پاکستان کے وقت مغربی پاکستان میں صرف دو یونیورسٹیاں تھیں جن میں سے ایک پنجاب یونیورسٹی لاہور تھی۔ اسی طرح دو میڈیکل کالج تھے جن میں سے ایک کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور تھا۔ دو انجینئرنگ کالج اور دولاء کالج تھے اور ان میں سے ایک ایک لاہور ہی میں تھا۔ اگر مقدار نہیں تو معیار کے اعتبار سے تعلیم کے میدان میں پنجاب کی اولیت

آج بھی قائم ہے۔ بعد میں بے شک دوسرے صوبوں، خصوصاً کراچی کی بدولت سندھ میں پنجاب کی بہ نسبت تعلیم کا بہت پھیلاؤ ہُوا لیکن مجموعی طور پر پنجاب نے جس وسیع پیمانے پر پڑھے لکھے لوگ، ڈاکٹر، انجینئر، وکلاء اور ماہرینِ علم پیدا کئے اس نے اسے ایک امتیاز بخش دیا جو پنجاب سے باہر کے دوستوں کو اسی طرح کھٹکنے لگا جس طرح اس کا وہ امتیاز کھٹکتا تھا جو اس نے فوج، سول ملازمتوں، زراعت، صنعت اور صحافت میں حاصل کیا تھا۔

پنجاب نے آزادیٔ ہند کے وقت دو ٹکڑے ہو کر اور اپنے لہو سے وضو کر کے عزم کیا تھا کہ وہ اپنا آپ پاکستان میں سمو دے گا اور اپنا امتیاز پاکستان میں حاصل کرے گا۔ مگر اُس کے اِس رویے نے "ماں نالوں ہیجلی پھپھے کٹنی " کے مصداق اسے دوسرے صوبوں کی نظر میں مشکوک بنا دیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ پاکستان بننے کے بعد گنے چنے پنجابی افراد نے ضرور ترقی کی لیکن پنجاب نے ایک صوبے کے طور پر بہت کم ترقی کی ہے بلکہ اس کی شرح خواندگی گر گئی ہے اور وہ صنعت میں بھی پیچھے رہ گیا ہے، دوسرے صوبوں نے انتہائی شدت سے محسوس کیا کہ پنجاب نے اپنے آپ کو پاکستان سمجھ لیا ہے اور اس کا ٹھیکے دار ہی نہیں بلکہ تھانے دار بن گیا ہے۔

پاکستان کے دوسرے صوبے دو نیم ہونے کے تجربے سے گزرے بنا اور خون میں نہائے بغیر پاکستان میں شامل ہوئے تھے۔ پھر ان کا اپنا اپنا تشخص برقرار تھا اور انہیں کوئی نیا تشخص ڈھونڈنے کی فوری ضرورت یا مجبوری نہ تھی۔ مگر شاید پنجاب کی یہ نفسیاتی ضرورت تھی کہ وہ اپنے وجود کو جو کٹ پھٹ کر آدھا رہ گیا تھا ایک بڑے وجود میں گم کر کے اپنا ایک نیا تشخص تلاش کرے۔ اس نئے تشخص نے اسے امتیاز تو ضرور بخشا لیکن اس کے باعث وہ اس روش پر بھی چل نکلا کہ اس نے اپنے آپ ہی کو پاکستان سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسروں نے اُس کی اس نفسیاتی ضرورت پر تو کیا غور کرنا تھا، انہوں نے اس کے خلاف محاکمہ دینے میں اس تشدد کو بھی مدِنظر نہ رکھا جو پنجاب کی تاریخ نے طویل صدیوں میں اس پر رہ رہ کر ڈھایا تھا۔ انہوں نے اس کی پاکستانیت کو ایک استحصالی حربہ اور غلبہ پسندی قرار دیا۔ انہوں نے اپنے آپ سے گریز اور پرہیز کے رویے کو پنجاب کی مکارانہ مفاد پرستی گردانا۔ انہوں نے پنجابیوں اور پنجاب میں کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا۔ انہوں نے پنجاب کے چار چودھریوں کو پانچ کروڑ پنجابیوں کا نمائندہ جانا۔ انہوں نے فوج اور نوکر شاہی کو پنجاب سے منسوب کر کے یہ سمجھ لیا کہ ان کی اور پاکستان کی ہر مصیبت کا ذمہ دار پنجاب ہے۔ انہوں نے نہ جانا تو یہ نہ جانا کہ پنجاب پر اس کی دردناک تاریخ کے بہت گہرے سائے پڑ چکے

ہیں۔ انہوں نے نہ سمجھا تو یہ نہ سمجھا کہ اس دردناک تاریخ کے باوجود پنجاب کا کردار اتنا ہی روشن ہے جتنا چند داغ دھبوں کے باوجود چودہویں کے چاند کا ہوتا ہے۔

تیسرا باب

تاریخ کا تشدّد

جس طرح پتنوں پر پڑاؤ ڈالنے والے اور بیلوں میں بسنے والے کبھی ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں ہوتے اسی طرح تاریخ کی گزر گاہوں پر آباد علاقے ہمیشہ نت نئے حملہ آوروں کی زد میں رہتے ہیں۔ اور پنجاب تو تاریخ کی گزر گاہ ہی پر نہیں 'اس کی ایک اہم ترین شاہراہ پر واقع تھا۔ یہ شاہراہ شمال سے جنوب کی طرف 'کوہ ہندوکش کے سنگلاخ دروں سے دلی اور آگرے کے تخت طاؤس کی جانب جاتی تھی۔

لیکن پنجاب* محض تاریخ کی ایک اہم ترین شاہراہ ہی نہیں ایک زرخیز زمین بھی تھی جو شمال کے فاقہ زدہ قبائل کو قریب آنے کی ترغیب دیتی رہتی تھی۔ بے شک شمال کے حکمرانوں کی نظر دلی اور آگرے کے زروجواہر پر بھی ہوتی تھی لیکن جنوب کی جانب ان کی آمد کا مقصد پنجاب کی سرسبزی اور شادابی سے بہرہ ور ہونا بھی تھا۔ پنجاب میں چونکہ جاگیرداری نظام اور بادشاہت نہیں تھے اس لئے یہاں نوکر شاہی اور ریاست کے دوسرے لوازمات بھی موجود نہ تھے۔ اگر یہ لوازمات موجود ہوتے اور پنجاب میں وہ جذبۂ مزاحمت نہ ہوتا جس کا مظاہرہ اس نے بار بار کیا تو اکثر حملہ آور پنجاب میں قیام کو ترجیح دیتے اور دلی اور آگرے کے سفر کی زحمت ہی نہ کرتے۔

بہرحال آج سے قریب قریب چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ مشرقی یورپ سے وسط ایشیا تک بکھرے ہوئے خانہ بدوش آریائی قبائل نے ابھی اپنے گھوڑوں اور رتھوں کا رخ ہندوستان کی طرف نہ موڑا تھا۔ اس وقت آج کا پاکستان دنیا کی چند گنی چنی تہذیبوں میں سے ایک پرامن تہذیب کا

گہوارہ تھا۔ سرحد سے بلوچستان تک پھیلی ہوئی اس تہذیب کا مرکز پنجاب میں ساہیوال کے قریب دریائے راوی کے کنارے آباد شہر ہڑپہ تھا۔ گو اس تہذیب کا دوسرا بڑا مرکز سندھ میں موئن جو دڑو تھا مگر قدامت اور مرکزیت کی بنا پر تاریخ اس وسیع علاقے میں جاری و ساری تہذیب کو ہڑپہ ہی کا نام دیتی ہے۔ قدامت کا ذکر آیا ہے تو یاد رہے کہ تاریخ عالم ہڑپہ تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب قرار دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تہذیب کے پنجابی مرکزوں کی کھدائی کی طرف بہت کم دھیان دیا گیا ہے۔ خود ہڑپہ شہر کے آثار بہت خراب و خستہ حالت میں ہیں۔

تھوڑی تھوڑی آبادی کے چھوٹے چھوٹے دیہات کی صورت میں جو اس زمانے میں بھی "پور" کہلاتے تھے یہ تہذیب قریب قریب ایک ہزار میل تک پھیلی ہوئی تھی اور ہڑپہ اور موئن جو دڑو کے شہراپنی منصوبہ بندی، نکاسیٔ آب کے نظام، فصیلوں، قلعوں اور عبادت گاہوں کے باعث اس تہذیب کا امتیازی نشان بن گئے تھے۔

یہاں اس تہذیب کے بعض آثار پر تھوڑی بحث بے موقع نہ ہوگی۔

ہڑپہ میں کھدائی کے دوران قلعے کے پاس ایک اونچے پلیٹ فارم پر ڈیڑھ سو فٹ چوڑے اور دو سو فٹ لمبے گودام کا پتا چلا ہے جس میں غلہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے یہ غلہ ارد گرد کی زرعی زمینوں سے ٹیکس کی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں اس علاقے میں چاول کاشت نہیں کیا جاتا تھا لیکن گندم، جو، مٹر اور تل بڑے پیمانے پر بوئے جاتے تھے۔ سب سے بڑھ کر، یہ علاقہ اس وقت بھی کپاس کاشت کرتا تھا جس سے طرح طرح کے ملبوسات تیار ہوتے تھے۔

ہڑپہ اور موئن جو دڑو تجارتی، مذہبی اور سیاسی مرکز تھے اور اس بات کا بیّن ثبوت ملتا ہے کہ اس علاقے میں ریاست کا ادارہ نہ صرف موجود تھا بلکہ اس کا سکہ ہزارہا میل تک یکساں چلتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس تمام علاقے میں ناپ تول کے پیمانے ایک تھے اور طرز رہائش میں غضب کی یکسانیت پائی جاتی تھی۔ سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اینٹوں کا سائز اور گھروں اور گلیوں کے نقشے ایک جیسے تھے اور رہائشی سہولتوں کے سلسلے میں زبردست مساوات پر عمل ہوتا تھا۔ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کے قدیم عہد میں محنت کشوں اور کاریگروں کے لئے دو دو کمروں پر مشتمل پکا گھر یقیناً اس تہذیب کی قوت کی دلیل ہے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہمارے قلیوں، کلرکوں اور ہنرمندوں کو رہائش کی یہ بنیادی سہولت میسر نہیں۔

گو اس پر امن معاشرے کے ارکان اس وقت بھی کسی ایک نسل سے تعلق نہ رکھتے تھے' بلکہ ان میں دراوڑیوں کے علاوہ حبشی' بابلی' منگولی اور بحیرۂ روم کے آس پاس آباد قوموں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے لیکن جب آریاؤں نے پنجاب کا رخ کیا تو صدیوں کے اس گھال میل اور میل ملاپ میں ہل چل اور گڑبڑ پیدا ہو گئی اور پھر یہی ہل چل اور گڑبڑ اس خطے کی تاریخ اور تقدیر بن گئی۔

آریائی حملہ آوروں سے پہلے پنجاب کے قدیم باشندے بھینسیں پالتے تھے' بیلوں کی مدد سے کھیتی باڑی کرتے تھے' ہاتھیوں اور گینڈوں کو رام کرنے کا ملکہ رکھتے تھے' دنیا کی ان اولین قوموں میں شامل تھے جو روئی پیدا کرنے اور کاتنے میں مہارت رکھتی تھیں' آری کی مدد سے کھلونے اور لکڑی کا دیگر سامان بنانا جانتے تھے اور اگرچہ بڑے پیمانے کے فن پارے تو نہ بناتے تھے لیکن چھوٹے چھوٹے مجسمے اور مہریں ڈھالنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ان مہروں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ ایک تصویری زبان بھی استعمال کرتے تھے جسے ابھی تک پوری طرح پڑھا نہیں جاسکا۔ لیکن ان مہروں پر جو تصویر کشی کی گئی ہے اس سے ان کے معاشرتی اور ثقافتی رویوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر ہڑپہ تہذیب کو ان مہروں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے جن میں جانوروں کی ماہرانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مہریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں عظیم الجثہ بیل اور وہ کوہانی سانڈ دکھایا گیا ہے جس کی گردن سے جھالریں سی لٹک رہی ہیں۔ اسی طرح گانٹھ دار کھال والے گینڈے اور دھاڑتے ہوئے شیر والی مہریں بھی مشہور ہیں۔ ان مہروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندومت نے اپنے ایک عظیم دیوتا' شوجی' جنھیں پشوپتی بھی کہا جاتا ہے' اسی علاقے کے قدیم باشندوں سے مستعار لئے تھے۔ چنانچہ ہڑپہ تہذیب میں ایسی مہریں بھی پائی گئی ہیں جن میں ایک دیوتا کو بیک وقت ایک شیر' ایک ہاتھی' ایک گینڈے اور ایک بیل کے درمیان کھڑا دکھایا گیا ہے۔ یہ بات خاصے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ دیوتا شوجی یا پشوپتی ہی ہیں۔

ہڑپے کی مہروں میں بیل کی تصویر کشی بار بار کی گئی ہے۔ بیل کا تعلق شوجی کے ساتھ ہمیشہ ہی سے جوڑا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی ان کے "پنجابی" ہونے کا ایک ثبوت ہے کیونکہ بیل کا ایک تعلق صدیوں سے اہل پنجاب کے ساتھ چلا آتا ہے۔ اس علاقے کے قدیم باسی بیل کو اسی طرح مقدس سمجھتے تھے جس طرح ان کے ہم عصر مصری باشندے فرعون موسیٰ کے زمانے میں۔ شاید اسی

لئے آج تک دوسرے صوبوں کے لوگ پنجابیوں کو "ڈھگے" یعنی بیل کہہ کر پکارتے آئے ہیں۔ یوں بھی قدیم زمانوں میں قبیلوں اور قوموں کو جانوروں یا پرندوں کے ناموں سے پکارا جاتا تھا چنانچہ بعض مفسروں کے مطابق قرآن پاک میں ہُدہُد اور چیونٹیوں کا ذکر انہی معنوں میں آیا ہے۔

بیل قدیم پنجابی تہذیب کی علامت تھا۔ لیکن اس تہذیب کی جو نشانیاں ہمیں ملی ہیں ان میں صرف سانڈ یا بیل کی تصویر کشی والی مُہریں ہی نہیں' کچھ دوسری اہم مُہریں بھی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ان مُہروں کو سامنے نہ رکھا جائے' پنجاب کے قدیم اور اصل مزاج کو نہیں پایا جا سکتا۔ ان میں سے ایک مُہر میں سورج کے چہرے والا ایک جواں مرد دو شیروں سے لڑتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہڑپے کا یہ جواں مرد دراصل نور کی علامت ہے جو ظلمت کی وحشی قوتوں سے نبرد آزما ہے۔ دوسری مُہر وہ ہے جس میں سینگوں والا ایک شخص سینگوں والے ایک شیر سے لڑتا ہُوا دکھایا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ مُہر تہذیب اور جہالت کی کشمکش کے مترادف ہے۔ پنجاب کا صحیح کردار متعین کرنے کے لئے صرف کھیتی باڑی کرنے والے بیل اور نسل کشی کرنے والے سانڈ والی مُہروں کو نہیں بلکہ نور و ظلمت کی جنگ اور تہذیب و جہالت کی کشمکش والی مُہروں کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پنجابی بے شک بیل کی طرح محنت کرتا اور سانڈ کی طرح زندگی کو آگے بڑھاتا آیا ہے لیکن ساتھ ہی وہ ظلمت اور جہالت کے خلاف نبرد آزما بھی رہا ہے۔

خانہ بدوش آریائی قبائل نے آج سے قریباً چار ہزار سال پہلے پنجاب کا رخ کیا تو یہاں کے قدیم باشندوں کے برعکس وہ نہ تو کسی تصویری یا تحریری زبان سے واقف تھے' نہ بستیاں بنا کر رہنے کے عادی تھے اور نہ سوتی یا اونی لباس سے آشنا تھے۔ ثقافتی اور تمدنی طور پر وہ ہڑپہ تہذیب سے بہت پیچھے تھے۔ البتہ ان کے پاس منہ زور اور تیز رفتار گھوڑے تھے اور ان کے آہنی ہتھیار ہڑپہ تہذیب کے لوگوں کے ہتھیاروں سے بہت زیادہ مہلک اور کٹیلے تھے۔ آریائی قبائل آندھی کی طرح آتے اور اس ہماری سرزمین پر آباد بستیوں کو اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روند کر بگولوں کی طرح آگے نکل جاتے۔ وہ بستیوں کو لُوٹتے اور جلا دیتے لیکن وہاں ڈیرے نہ ڈالتے۔

اس سلسلے میں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ آریائی قبائل کسی ایک خاص دن کوہ ہندوکش سے اتر کر پنجاب میں داخل نہ ہو گئے تھے' بلکہ ان کی آمد کا سلسلہ موج در موج کم از کم پانچ صدیوں تک پھیلا ہوا تھا اور ان صدیوں کے دوران حملہ آوروں کے ہاتھوں قدیم باشندوں کا مسلسل خون خرابہ ہوتا رہا تھا۔ بے شک قدیم باشندوں نے مقدور بھر مزاحمت کی اور آریاؤں کو بار بار مار بھگایا لیکن بالآخر

آریائی حملہ آور کامیاب رہے گو انہیں یہ کامیابی آسانی سے ہاتھ نہ آئی تھی۔

"رگ وید" جو اِس سرزمین کی قدیم ترین اور محفوظ ترین دستاویز ہے اور جسے ہندو مت میں الہامی کتاب کا مقام حاصل ہے' اس دور کے حالات' واقعات اور کیفیات کی عکاسی کرتی ہے۔ جو منتر اور مناجاتیں اس میں درج ہیں ان میں اُس کشمکش کا بار بار ذکر آتا ہے جو حملہ آوروں اور مقامی آبادیوں کے درمیان صدیوں تک جاری رہی۔ ظاہر ہے' "رگ وید" آریاؤں کی کتاب تھی اس لئے اس کے منتروں اور مناجاتوں میں انہی کی فتوحات کے لئے دعائیں کی جاتی تھیں اور یاد رہے کہ دعاؤں کی ضرورت اسی وقت پڑا کرتی ہے جب دشمن کمزور نہیں بلکہ مقابلے کی چوٹ ہو۔ بہرحال حملہ آوروں کو وسط ایشیا سے نت نئی کمک ملتی رہی اور ان کی گنتی اور حملوں کی تعداد بڑھتی گئی اور تیز رفتار گھوڑوں کی صورت میں ان کی بہتر سواری اور پختہ تر دھاتوں کی بنا پر ان کے بہتر ہتھیاروں نے بالآخر مقامی آبادیوں کو زیر کر لیا۔ چنانچہ زیر ہونے والے مقامی لوگوں کو "رگ وید" میں "داس" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ "داس" اور "داسی" اسی زمانے کے الفاظ ہیں جو غلام' محکوم اور خادم کے معنی میں آج تک مستعمل ہیں۔

بعد کے زمانے میں وحشی آریائی قبیلوں اور ان کے زیرِنگیں مہذب "داسوں" میں شادی بیاہ کے بندھن پیدا ہو گئے اور یوں پنجابی خون میں حملہ آوروں کی تندی و تیزی اور ان کا احساسِ فتح بھی باقی رہ گیا اور داسوں کا دھیماپن اور احساسِ شکست بھی۔

اب آیئے ذرا بیرونی حملے کے اس منظر کی سطح سے نیچے اس کی تہہ میں اترنے کی کوشش کریں۔

بیرونی حملے سے صرف مالی اور اقتصادی نقصان ہی نہیں ہوتا' اس سے ایک نفسیاتی بے یقینی اور عدم تحفظ کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے اور جب بیرونی حملہ تاریخ کی عادت بن جائے تو یہ ایک بے رحمانہ تشدد بن جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ تشدد وہی نتائج پیدا کرتا ہے جن کی خاطر ہر دور کے جابر حکمران اپنے مخالفوں پر تشدد کرتے آئے ہیں۔ تشدد کو اسی لئے ایک غیر انسانی حرکت سمجھا جاتا ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اندر' کسی جگہ' اپنے آپ سے شرمندہ رہنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ بار بار اپنے تحفظ میں ناکام رہتا ہے اور لگاتار تشدد کے باعث بار بار بے اختیار روتا' چیختا اور کراہتا ہے تو آہستہ آہستہ خود اپنی نظروں میں گر جاتا ہے۔ آج اگر پنجاب اپنے آپ سے شرمندہ شرمندہ نظر آتا ہے تو اس کے پیچھے تاریخ کے اس تشدد کو دیکھنا چاہیے جو آریائی قبائل سے شروع ہو کر یونانی' باختری' ساسانی' پہلوی' ہن' تاتاری' غزنوی' مغل'

درانی' ابدالی اور انگریز حملہ آوروں تک جاری رہا۔

پنجاب کی عظمت یہ ہے کہ اگرچہ تاریخ اس پر' دو چار مرتبہ نہیں' متواتر اور مسلسل یہ تشدد توڑتی رہی لیکن وہ اپنی بار بار مجروح ہونے والی عزتِ نفس کو بحال کرنے کے لئے بار بار مزاحمت کے محاذ قائم کرتا رہا۔ اس ضمن میں سکندر اعظم کے حملے کے موقع پر دریائے جہلم کے کنارے پنجاب کے راجہ پورس کی طرف سے بہادرانہ مقابلہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میں نے بارہا سوچا ہے کہ کیا ہم پنجابی محض پورس کے ہاتھیوں جیسا مزاج رکھتے ہیں جنھوں نے بالآخر اپنی ہی فوج کو روند ڈالا تھا؟ لیکن ہر بار مجھے یہ حقیقت حوصلہ دیتی ہے کہ پنجاب کی تاریخ میں پورس کے ہاتھی ہی نہیں خود پورس اور اس کے جواں مرد ساتھی بھی تو ہیں۔ اردو زبان نے "پورس کے ہاتھیوں" کو محاورے میں ڈھال کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ پنجابیوں نے اردو زبان اپنالی اور اپنی تاریخ کو بھلا دیا۔ جب تک وہ اپنی زبان بولتے اور اسی میں سوچتے رہے وہ راجہ پورس کے جذبۂ مزاحمت کے وارث رہے۔ لیکن جب سے اردو بولنے اور اس میں سوچنے لگے ہیں وہ حملہ آوروں سے مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سکندر کو دنیا فتح کرنے کی مہم اس لئے ترک کرنی پڑی کہ اس کے جرنیلوں اور سپاہیوں کی ہمت جواب دے گئی تھی جو مزید آگے بڑھنے کے بجائے وطن واپس جانے کے لئے بے تاب ہو گئے تھے۔ لیکن اس حقیقت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی کہ یہ صورت حال اسے پنجاب میں درپیش آئی۔ سکندر یونان سے چلتے چلتے پنجاب پہنچ گیا اور کسی مائی کے لال نے اس کی سیلاب کی طرح امڈتی فوجوں کے آگے بند نہ باندھا کہ اس سیلاب کا رخ پھر جاتا۔ اس کے جرنیلوں کا حوصلہ ہر جگہ آگے بڑھنے کے لئے بلند رہا۔ لیکن پنجاب پہنچ کر یہ صورت حال کیسے بدل گئی؟ یہاں پہنچ کر ان کے حوصلے کیوں پست ہو گئے؟ ایسا کیونکر ہوا کہ دریائے بیاس کے دوسرے کنارے کھڑے پنجابیوں نے اس فاتحِ عالم اور اس کے ساتھیوں کو منہ لپیٹ کر پلٹ جانے کی راہ دکھا دی اور یوں روئے زمین پر بپھرتا ہوا یہ سیلاب دیکھتے ہی دیکھتے اتر گیا؟

یہاں یہ بتانا بھی غیر ضروری نہ ہو گا کہ سکندر سے پہلے پنجابیوں نے قرآن پاک میں مذکور ایرانی سلطنت کے بانی ذوالقرنین کو' جسے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق کے مطابق "سائرس دی گریٹ" کہا جاتا ہے' شکست دی تھی۔

سکندر کے جانے کے بعد کچھ عرصے کے لئے امن رہا۔ خصوصاً جب موریہ خاندان کا تسلط

پورے ہندوستان پر جم گیا اور اشوک نے بدھ مت اختیار کر لیا تو پنجاب میں ٹیکسلا کی اہمیت بڑھ گئی اور آج کے اسلام آباد کی ہمسائیگی میں آباد یہ علاقہ علم و فضل کا بہت بڑا گہوارہ بن گیا۔ لیکن امن کا یہ دور زیادہ دیر نہ چلا اور سکندر کے جانشین یونانیوں اور باختری اور ایرانی حملہ آوروں نے ایک لمبے عرصے تک اس علاقے پر پے در پے یورشیں شروع کر دیں۔

قدیم ہندوستانی تاریخ میں یونانیوں کے حملوں کا بار بار ذکر آتا ہے۔ پنجاب کے ایک یونانی حکمران ملنڈا کا تذکرہ تو بدھ مت کی روایات میں بھی موجود ہے۔ وہ سیالکوٹ کا حاکم اور ناگ سین نامی رشی کا مربی تھا جس کے ساتھ اس کے مکالمات اور طویل بحثیں "ملنڈا کے سوالات" کے زیر عنوان پالی دستاویزوں میں درج ہیں۔

پہلی صدی قبل مسیح میں پنجاب پر حملہ آوروں کی فہرست میں وہ ایرانی بادشاہ بھی شامل ہو گئے جنھیں عموماً پہلویوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر پہلویوں کو چین سے نیچے اترنے والے یوہ چیہہ قبائل نے زیر کر لیا۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں کنشک نے شمالی ہندوستان پر جس میں موجودہ پاکستان کے علاقے بھی شامل تھے قبضہ کر لیا اور بدھ مت کا ایک عظیم سرپرست بن گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پنجاب کے گندھارا مکتبِ فن کا دائرۂ اثر نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ مشرقِ بعید تک پھیل گیا۔

تاریخ نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور ہندوستان کے طول و عرض پر بکرماجیت کا سنہری دور طلوع ہوا۔ یہ کالی داس کا زمانہ تھا۔ مگر اس دور میں ہندو مت نے بدھ مت کو دھکے دے دے کر دیس نکالا دینا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح بدھ مت کے پیروکار پنجاب میں بڑی بڑی سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ اوپر سے ہمارے حصے کے ہندوستان پر ہُن قبائل چڑھ آئے اور انہوں نے دور دور تک تباہی مچا دی۔ گویا یہ سنہری دور بھی پنجاب کے لئے پریشانیاں ہی لے کر آیا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نے موت کی طرح پنجاب کو تاک لیا تھا اور نت نئے حملہ آوروں کی صورت میں بار بار اس کے گھر پر چھاپہ مارتی تھی۔ چنگیز خان ہو یا تیمور، محمود غزنوی ہو یا بابر، نادر شاہ درانی ہو یا احمد شاہ ابدالی، تاریخ نے پنجاب کو کبھی دم نہیں لینے دیا۔ پنجاب نے ان سب سے ٹکر لی اور انہیں بار بار واپس جانے پر مجبور کیا۔ جسرتھ کھوکھر نے سلطان محمد غوری کا مقابلہ کیا۔ محمد غوری کی قبر کا آج جو بُرا حال ہے وہ پنجاب کے جذبۂ مزاحمت کی بڑی واضح دلیل ہے۔ لیکن حملہ آوروں اور حملوں کا تانتا اس قدر زور سے بندھا ہوا تھا کہ اگر پنجابی بار بار جیتتے تھے تو کسی نہ کسی مرتبہ

ہار بھی جاتے تھے۔

میں یہاں اس مسئلے پر بحث نہیں کر رہا کہ نت نئے حملہ آور شمال سے جنوب کی طرف کیوں آئے اور ان کا آنا اچھا تھا یا برا۔ نہ میں ان مسلمان عوام و خواص کا دل دُکھانا چاہتا ہوں جو مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کو تاریخِ اسلام سمجھتے اور ان کی فتوحات کو اسلام کی فتوحات گردانتے ہیں۔ میں تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ پنجاب نے تاریخ کے تھپیڑوں میں بہت کم سُکھ کا سانس لیا ہے۔ بلکہ 'اس کے برعکس' تاریخ کے تشدد نے ہمیشہ ہی اس کے ہوش و حواس گم رکھنے کا سامان کیا ہے۔

بے شک تاریخ کے اس تشدد نے پنجاب کے کردار میں پھرتی' چابکدستی اور لچک پیدا کر دی ہے اور اسے زندگی کے مشکل ترین لمحات میں بھی جینے کا حوصلہ بخشا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے اندر ایک عدم استحکام 'ایک عدم تحفظ 'ایک احساسِ شکست اور ایک خاص طرح کی بے بسی کو بھی جنم دیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر' تاریخ کے تشدد کا نتیجہ یہ مرتب ہوا ہے کہ پنجاب نے پنجاب کے اعتبار سے اپنی پہچان چھوڑ دی۔ جب سے اسے پتہ چلا ہے کہ تاریخ نے موت کی طرح اسے اپنا ہدف بنالیا ہے' وہ تاریخ کے حملوں سے بچنے کی خاطر بالکل اسی طرح اپنے آپ سے انکار کرتا پھرتا ہے جیسے رومی سپاہی حضرت عیسٰی کو پکڑ کر لے گئے تو ان کے مشہور حواری پطرس نے نہ صرف ان سے بلکہ اپنے پطرس ہونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

انسانوں کی پرانی عادت ہے کہ جینے کی تمنا میں وہ ان درد بھرے واقعات کو بھول جایا کرتے ہیں جنھیں ہر وقت یاد رکھنے سے جینے کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ آپ نے عزیز و اقارب کی وفات پر دور و نزدیک کے لواحقین کو ذوق و شوق سے کھانا کھاتے دیکھا ہو گا۔ یہ موت کو بھلانے کا ایک جتن اور جینے کی تمنا کا ایک اظہار ہی تو ہے! جب بھٹو مرحوم کے دور میں ٹیلی ویژن پر ڈھاکے میں پاکستانی فوجوں کو بھارتی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے دکھایا گیا تو ہمارے عوام نے شدید احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ یہ منظر دوبارہ ہرگز نہ دکھایا جائے۔ ایک ناقابلِ برداشت درد کو پیچھے چھوڑ جانے کے سوا اس رویے کا اور کیا مقصد و مطلب ہو سکتا ہے؟ پنجاب کی نفسیات بھی اسی رویے کی غمازی کرتی ہے۔ اسے بھی جینے کی تمنا لاحق ہے اور وہ بھی اپنے درد بھرے ماضی سے آنکھ چراتا رہتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ آج بھی اس کے شہروں اور قصبوں میں بربریت اور بربادی کی ایسی ایسی نشانیاں موجود ہیں جو یاد نہ رکھنے کی خواہش کے باوجود پنجاب کو یاد دلاتی رہتی ہیں کہ گذشتہ قدیم

صدیاں تو دور رہیں حالیہ دو ایک صدیوں میں اس کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا تھا۔ کیسے کیسے اُسے لُوٹا گیا' پامال کیا گیا' کیسے کیسے اس کا استحصال کیا گیا۔

بے شک پنجاب میں ہڑپہ تہذیب کے دوران 'موریہ اور گپت خاندانوں کے عہد میں' یا پھر اکبر سے شاہجہان تک کے مغلیہ دور میں تاریخ کے تھپیڑے ذرا تھم گئے اور اس کا تشدد ذرا دھیما پڑ گیا ورنہ آریاؤں' یونانیوں' ہنوں' تاتاریوں' غزنویوں' مغلوں اور ابدالیوں کے گھوڑوں کے سموں تلے بار بار اجڑتا اور پھر اپنی قوت حیات کے بل بوتے پر وہ بار بار بستا رہا ہے۔

ذرا تصور کیجئے کہ ہر بیرونی حملے کے بعد کس طرح پنجاب کے کسان برسوں کی محنت سے اپنے برباد علاقوں کو از سرِ نو تعمیر کرتے ہوں گے' اپنی اجڑی کھیتیوں کو اپنے خون پسینے کی محنت سے از سرِ نو سنوارتے ہوں گے' اپنے شہروں' قصبوں اور دیہات کے درمیان آمدورفت کا از سرِ نو کوئی نیا نظام قائم کرتے ہوں گے' اپنی تجارت اور حرفت کے بکھرے تنکوں کو جوڑ کر از سرِ نو تعمیر کا خواب دیکھتے ہوں گے اور اتنے میں انہیں سناؤنی ملتی ہو گی کہ حملہ آوروں کا ایک اور لشکر گرد اڑاتا ان کی طرف بڑھا چلا آتا ہے۔ یہ جاننا چنداں مشکل نہیں کہ ایسے میں ان کے دل پر اور ان کے ہوش و حواس پر کیا گزرتی ہو گی۔

حملہ آور لشکر اُس وقت نہ تو ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے آسمان سے نازل ہوتا تھا' نہ کولتار کی پکی سڑکوں پر لاریوں اور ٹرکوں میں رسد ساتھ لے کر وارد ہوتا تھا۔ یہ لشکر تو ہزاروں گھوڑوں کی پیٹھوں پر نمودار ہوتا تھا جو چارے کی ضرورت ساتھ لاتے تھے۔ یہ لشکر ان گھوڑوں پر سوار ہزاروں لشکریوں پر مشتمل ہوتا تھا جنہیں دودھ' گوشت اور اناج کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور اس ضرورت کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ یہ ضرورت بیٹھے بٹھائے آسمانی بلاؤں کی طرح زمین کے آفاق سے پھوٹ پڑتی تھی' پھوٹی تقدیر کی طرح' بے اماں موت کی طرح۔

حملہ آوروں نے تو آج کے مہذب زمانے میں بھی یہ آداب نہیں سیکھے کہ جن سرزمینوں پر چڑھ دوڑتے اور انہیں اپنے قدموں تلے روند ڈالتے ہیں وہاں کی بے قصور اور بے بس مقامی آبادیوں کو نقصان کے عوض یا تلافی کے طور پر کوئی معاوضہ پیش کر دیں۔ پھر بھلا آریاؤں سے انگریزوں تک پنجاب پر حملہ آور ہونے والوں سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی تھی کہ جب وہ تباہی و بربادی کے جھنڈے لہراتے آئیں تو اپنے گھوڑوں کے لئے جس چارے کی اور اپنے لشکریوں کے لئے جس خوراک کی ضرورت ہو مقامی آبادیوں کو اس کی جائز قیمت ادا کیا کریں۔

تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ' انگریز سے پہلے صدیوں تک پنجاب کے بیشتر حصوں میں جاگیرداری نظام کے بجائے ایک طرح کا گوپالی (پاسٹرل) معاشرہ قائم رہا ہے۔ بادشاہت اور نوکر شاہی پیدا ہی وہاں ہوتے ہیں جہاں جاگیرداری نظام موجود ہو۔ پنجاب میں انگریز سے پہلے جاگیرداریاں نہ ہونے کے باعث بادشاہت اور نوکر شاہی بھی نہیں تھی۔ ایسے میں جہاں حملہ آوروں کا یہاں تسلط جمانا مشکل تھا وہاں پنجابی عوام کو بھی اپنی حفاظت کا خود ہی بندوبست کرنا پڑتا تھا۔

جب بھی پنجاب کے کسی افق پر کوئی نیا لشکر نمودار ہوتا تو مقامی آبادیاں کوشش کرتیں کہ اپنے علاقے خالی کر کے دُور کے محفوظ علاقوں میں چلی جائیں۔ کسی مستحکم نظام حکومت کی عدم موجودگی میں ان آبادیوں کو اچھی طرح پتا ہوتا تھا کہ ان کی حفاظت کے لئے کوئی نہ آئے گا۔ مہلک تر ہتھیاروں اور ترقی یافتہ جنگی مہارتوں سے لیس حملہ آوروں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ اور بے بس پاتے تھے۔ انہیں علم ہوتا تھا کہ اگر وہ اپنی بستیوں ہی میں بیٹھے رہتے ہیں تو جہاں ان کی جانیں چلی جائیں گی اور کھیتیاں اجڑ جائیں گی وہاں حملہ آور لشکریوں کے ہاتھوں ان کی بہو بیٹیوں کی عزت بھی لٹ جائے گی۔ وہ اسی میں عافیت جانتے تھے کہ اپنے اہل و عیال اور کھیتی باڑی کرنے والے بیلوں کو لے کر حملہ آوروں کی زد سے کہیں دور نکل جائیں۔

وہ آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں ان کی کھیتی کا بچنا ممکن نہیں کہ اسے تو حملہ آوروں کے گھوڑے چر جائیں گے۔ وہ اس بات کے لئے بھی تیار رہتے تھے کہ ان کی گائے بھینسوں ' بھیڑ بکریوں اور مرغی انڈوں کا صفایا آنے والے لشکری کر جائیں گے۔ لیکن نقل مکانی میں انہیں یہ تسلی ضرور ہوتی تھی کہ حملہ آوروں کی پہنچ سے پرے ہو کر کم از کم ان کی جان اور آبرو تو بچ جائے گی ' ان کے بال بچے تو محفوظ رہیں گے اور ہل جوتنے کے لئے بیلوں کی جوڑی تو سلامت ہو گی۔

اہل پنجاب کے صبر اور شکر نے انہیں سکھا دیا تھا کہ اچھے دن نہیں رہتے تو بُرے دن بھی نہیں رہا کرتے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک نہ ایک دن حملہ آور اپنی حرص و طمع کا سامان لے کر واپس چلے جائیں گے اور نئے حملہ آور کے آنے تک تھوڑے عرصے کے لئے ہی سہی ' امن امان قائم ہو جائے گا۔ ان کی یہی سوچ انہیں زندہ رکھتی تھی۔ اور جب ان کی سوچ صحیح ثابت ہوتی تھی تو وہ ایک مرتبہ پھر اپنی معیشت اور معاشرت کے ملبے کو کریدنے لگتے تھے۔ وہ تنکہ تنکہ جوڑ کر آشیانہ

بنانے کے لئے اُسی طرح میدانِ عمل میں کود پڑتے تھے جس طرح بہار آنے پر پرندے نیا گھونسلہ بنانے کے لئے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

اس امید و یاس اور تعمیر و تخریب نے اہل پنجاب کے مزاج میں دو بہت متنازعہ فیہ رویوں کو جنم دیا ہے۔ پہلے رویے کو دشمنانہ نظر سے دیکھیں تو کہا جائے گا کہ پنجابی حال مست اور کھال مست ہو گئے ہیں۔ ذرا محبت کی نظر سے دیکھا جائے تو اسے صابر و شاکر ہونا بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میری نظر میں یہ رویہ ایک نفسیاتی بے بسی سے عبارت ہے جو پنجابیوں کو دیر تک حالات کے جبر کے آگے صبر کا بند باندھے رکھنے پر اکساتی ہے۔ اعتراض کرنے والے اس بے بسی کو اہل پنجاب کے منہ پر "موقع پرستی" لیکن درپردہ "بے غیرتی" کا نام دیتے ہیں۔

دوسرا رویہ پنجابیوں کی یہ خواہش ہے کہ کوئی ایسا قابلِ اعتماد نظامِ حکومت موجود ہو جو ان کی حفاظت کی ضمانت دے۔ پنجاب نے کبھی مبہم اور کبھی واضح انداز میں ملک کے اندر ہمیشہ مضبوط مرکز کی ضرورت محسوس کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس نے مضبوط مرکز کا مطالبہ نہیں کیا تو اندر ہی اندر اس کی خواہش ضرور کی ہے۔ یہ خواہش بھی اُس کے اسی عدم تحفظ کے تجربے سے پیدا ہوئی ہے جو بار بار اُجڑنے اور بار بار بسنے سے اس کے وجود کا فعال حصہ بن گیا ہے۔

مزاحمت کی خاطر بار بار موت کی آنکھوں میں جھانکنے والا پنجاب زندگی سے بھی محبت رکھتا تھا۔ یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ تاریخ کے ایسے ظالمانہ تشدد کو سہ گیا جس کا عشر عشیر بھی پاکستان کے دوسرے صوبوں نے نہ سہا ہو گا۔ اخبارات میں آئے دن اس طرح کے واقعات بیان ہوتے رہتے ہیں کہ جنّات بعض مکانوں پر اینٹوں اور خون کی بارش کر دیتے ہیں جس کے باعث مکانوں کے مکین بھاگ جاتے اور اکثر اوقات دیوانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ نے پنجابیوں کے "مکان" پر جس تسلسل کے ساتھ اینٹوں اور خون کی بارش برسائی ہے اگر اس کے باوجود آج پنجاب نہ صرف سلامت بلکہ شاد و آباد ہے اور اس کے ہوش و حواس بھی قائم ہیں تو یہ اس کی ہمت، استقامت اور جفاکشی کے سوا اور کیا ہے؟

معترضین ہمیشہ کہتے ہیں کہ پنجاب کو جنگ کا بخار بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ صدیوں کے تشدد نے پنجاب کو جس طرح بار بار برباد کیا ہے اگر خدانخواستہ پاکستان کے دوسرے علاقے بھی اس بربادی کا شکار ہوئے ہوتے تو انہیں بخوبی اندازہ ہوتا کہ زندگی میں جنگ کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد بھی پنجاب کی سرحدیں ہمیشہ حملہ آوروں کی زد میں رہیں۔ ۱۹۶۵ء اور

۱۹۷۱ء کی باقاعدہ جنگوں کے دوران زیادہ تر پنجاب ہی کا خون بہا ہے' زیادہ تر پنجاب ہی کے کھیت اور کھلیان تباہ ہوئے ہیں۔ پنجاب کو جنگ کا بخار نہیں' امن کی آرزو ہے۔ لیکن اس کی تاریخ نے اس کی ہڈیوں کے گودے تک میں یہ اطلاع بہم پہنچا دی ہے کہ امن کی آرزو کا متحمل کوئی کمزور نہیں ہو سکتا' جسے امن چاہئے اسے طاقتور ہونا ہو گا۔ پنجاب طاقتوروں اور زبردستوں کے ہاتھوں ان گنت مرتبہ تباہ و برباد ہوا ہے۔ اسے عادت تو تباہ و برباد ہونے ہی کی ہے لیکن اب اس کے ضمیر میں ایک کانٹا بھی اُگ چکا ہے کہ میں کب تک حملہ آوروں کے ہاتھوں لٹتا رہوں گا۔ حقیقت اتنی ہے کہ پنجاب اب کسی حملہ آور کے ہاتھوں لٹنے کو تیار نہیں۔ وہ متوقع دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔ کوئی اسے جنگ کا بخار کہہ لے' میری دانست میں یہ امن کی سادہ لیکن شدید آرزو ہے۔

پنجاب نے پاکستان کی صورت میں ایک آزاد اور خود مختار ملک کا حصہ بن کر رہنے کا خواب دیکھا تھا اور پاکستان کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کی حد تک وابستہ کر کے اُن زخموں سے نجات پانے کی راہ نکالی تھی جو تاریخ نے صدیوں تک اس کے جسم پر لگائے تھے۔ لیکن صدیوں کے تشدد نے پنجاب کے جسم ہی پر نہیں اس کی نفسیات پر بھی کچھ سائے ڈالے ہیں۔ آج پنجاب کو خود اپنا محاسبہ کرنا ہے اور اپنے جسم کے زخموں کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کے اِن سایوں سے بھی نجات حاصل کرنی ہے۔

قوموں اور قومیتوں کا کوئی مخصوص یا اٹل مزاج نہیں ہُوا کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نسل پرستی کا جواز پیدا ہو جاتا جو ایک غیر انسانی اور غیر اسلامی تصور ہے۔ قومیں اور قومیتیں تاریخ کے مختلف ادوار میں اور اپنی نشوونما کے مختلف مدارج پر کچھ رویوں اور رجحانات کو اپنا لیتی ہیں۔ وہ قومیں اور قومیتیں جنھیں زندگی کے سفر میں نت نئی للکاریں درپیش ہوں صحت مند رویوں اور رجحانات کو مستحکم کرتی چلی جاتی ہیں اور غیر صحت مند رویوں اور رجحانات سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں۔ جو قومیں اور قومیتیں ایسا نہیں کر پاتیں وہ پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنے آپ کو ملیامیٹ کر لیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پنجاب جو صدیوں تک تاریخ کے ظلم و ستم کا شکار رہا اور آج بھی زندہ و پائندہ ہے اپنے اندر موجزن زندگی کی بے پناہ قوت کو کام میں لاتے ہوئے ان رویوں اور رجحانات کو اپنانے میں دیر نہیں کرے گا جو اسے پورس کے ہاتھیوں کے بجائے راجہ پورس کی راہ پر ڈال دیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ سے شرمندہ رہنے کے بجائے فخر سے سر اٹھا کر چل سکے اور بڑے سے بڑے سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

چوتھا باب

قیادت کا فقدان

کچھ عرصے سے میں پنجاب کے پانچ کروڑ عوام کی طرف سے پاکستان کے دوسرے صوبوں کے قائدین اور عوام سے یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اگر فوجی حکومتوں اور نوکر شاہی کی طرف سے ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو اس میں پنجاب کے عوام کا عمل دخل نہیں. فوجی حکومتوں اور نوکر شاہی نے جو کچھ دوسرے صوبوں کے ساتھ کیا ہے وہی کچھ انیس بیس کے فرق سے پنجاب کے ساتھ بھی کیا ہے۔ پنجابی نوکر شاہی کو لے لیں۔ وہ بلوچستان ' سندھ اور سرحد میں اس قدر بے شرمی سے تشدد ' ظلم اور استحصال نہیں کرتی جس قدر پنجاب میں کرتی ہے۔ چھوٹے صوبوں کو چاہئے کہ فوج اور نوکر شاہی کو پنجاب کا نمائندہ تصور نہ کریں۔ بے شک ان دو اداروں میں پنجاب کی عددی اکثریت ہے لیکن یہ دو ادارے ہی تو پورا پنجاب نہیں۔ چھوٹے صوبوں کے عوام کو پنجاب کے پانچ کروڑ عوام سے بات کرنی چاہئے ' ان کے نمائندوں کی پنجاب کے نمائندوں سے بات ہونی چاہئے۔

میری اس جسارت پر دوسری طرف سے پہلا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر فوجی حکومتیں اور نوکر شاہی پنجاب کی نمائندہ نہیں تو پھر پنجاب کے پانچ کروڑ عوام انہیں اپنے اوپر پیر تسمہ پا کی طرح سواری کرنے کی مہلت کیوں دیتے ہیں اور ہمت کر کے انہیں اپنے کندھوں سے جھٹک کیوں نہیں دیتے۔ اور یہیں سے دوسرا اعتراض شروع ہوتا ہے: دوسرے صوبوں کے قائدین پوچھتے ہیں کہ آخر ہم پنجاب میں بات کس سے کریں۔ پنجاب نے تو اپنی قیادت کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی ' وہ تو کبھی اپنے کسی

قائد کے پیچھے کھڑا ہی نہیں ہُوا گویا پنجاب میں قیادت کا فقدان ہے۔

پنجاب میں قیادت کے فقدان کا مسئلہ کئی پہلو رکھتا ہے۔ مثلاً یہ فقدان کب سے ہے، کیوں ہے اور آج اس کی کیا کیفیت اور نوعیت ہے۔

قیادت آسمانوں سے نازل نہیں ہُوا کرتی، زمین سے اُگا کرتی ہے۔ پیغمبروں پر وحی بے شک آسمانوں سے نازل ہو جائے، یا وہ معراج کی صورت آسمانوں تک بلند ہو جائیں بہرحال وہ بھی زمین ہی پر پیدا ہوتے ہیں۔ تاریخی طور پر پنجاب میں قیادت کا فقدان نہیں رہا۔ یہاں پورس سے لے کر رنجیت سنگھ تک سیاسی قیادت بھی رہی ہے اور اس سرزمین نے ہندومت کو شوجی جیسے دیوتا بھی عطا کئے ہیں اور سکھ مذہب کے بانی گورونانک اور احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد بھی پیدا کئے ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ پنجاب میں طویل عرصوں تک ایسی مستحکم حکومتیں یا بادشاہتیں قائم نہیں ہوئیں جو اس سرزمین کا دفاع اور یہاں بسنے والے عوام کی حفاظت کر سکتیں۔

ایسا کیوں ہوا؟

اس سوال کے حقیقت پسندانہ جواب کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تہذیبی اور سماجی عوامل کو پیش نظر رکھا جائے وہاں پنجاب کے اقتصادی اور مادی حالات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

پاکستان کے دوسرے صوبوں کی بہ نسبت پنجاب میں انگریزوں سے پہلے زراعت نے بھی اتنی وسعت اختیار نہیں کی کہ یہاں بڑی بڑی جاگیریں قائم ہو سکتیں۔ وہ جاگیرداری نظام جو دریائی ڈیلٹاؤں میں واقع صوبوں مثلاً بنگال اور سندھ میں پیدا ہو گیا، انگریزوں سے قبل پنجاب میں پیدا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ پنجاب کے دریا اتنے تیز بہتے تھے کہ ان سے سندھ کی طرح وہ موسمی نہریں نکالی ہی نہ جا سکتی تھیں جو زرعی ترقی کو اس درجے تک پہنچا دیتیں کہ جاگیرداری وجود میں آ جاتی۔ بے شک انگریزوں سے پہلے بھی پنجاب میں اپر باری دو آب اور سرہند جیسی دو ایک نہریں موجود تھیں لیکن آج یہاں جو دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام نظر آتا ہے وہ انگریزی عہد حکومت ہی کی پیداوار ہے۔

اس علاقے میں زراعت ضرور تھی لیکن یہ انگریزوں سے پہلے زرعی سے زیادہ ایک گوپالی (PASTORAL) معاشرہ تھا۔ تھوڑی بہت زراعت دریاؤں کے کنارے یا پھر سیالکوٹ، گورداسپور، ہوشیارپور جیسے چاہی علاقوں میں موجود تھی۔ لیکن پنجاب کے بیشتر حصوں میں لوگ گائے بھینسیں پالتے تھے اور دودھ، دہی، مکھن، لسّی اور گوشت پر گزارہ کرتے تھے۔ وہ کسی حد تک بھیڑ بکریاں بھی رکھتے تھے لیکن ان کا انحصار گائے بھینسوں پر تھا نہ کہ بھیڑ بکریوں پر۔ چنانچہ وہ

بلوچ یا عرب قبائل کی طرح خانہ بدوش نہ تھے جو بستیاں بسا کر رہنے کے بجائے اپنے ریوڑوں کے لئے گھاس کی تلاش میں چل پھر کر زندگی کا میلہ دیکھتے ہیں۔

پنجابی معاشرہ قبائلی تو تھا لیکن خانہ بدوش نہ تھا۔ پنجابیوں کے پاس وسیع و عریض مستقل چراگاہیں اور ہرے بھرے جنگل تھے جہاں ان کے مویشی آسانی سے چر سکتے تھے۔ وہ متمدن اور خوشحال لوگ تھے اور وسط ایشیائی طور طریقوں کے برعکس امن کے قائل تھے' دوسروں پر حملہ آور ہو کر انہیں ختم کرنے کے درپے نہ تھے۔

دنیا بھر میں زراعت کے پھیلاؤ ہی سے جاگیرداری نظام پیدا ہُوا۔ پنجاب میں چونکہ زرعی کے بجائے گوپالی معاشرت تھی اس لئے یہاں جاگیرداریاں ناپید تھیں۔ اسی طرح یہاں ظالم اور مظلوم' حاکم اور محکوم' یا جابر اور مجبور جیسے انسانی رشتے بھی موجود نہ تھے جو جاگیردارانہ معاشروں کی پہچان ہیں۔ بادشاہت بھی جاگیرداری نظام ہی کی پیداوار ہے۔

دنیا بھر میں بادشاہت کا عروج زراعت کے پھیلاؤ اور جاگیردارانہ نظام کے استحکام کے ساتھ ہُوا۔ بعد میں جہاں جہاں زراعت کی جگہ صنعت نے لے لی وہاں جمہوریت زور پکڑتی گئی اور بادشاہت عملاً ختم ہو گئی۔ سچ مچ کی بادشاہت نہ تو جاگیرداری سے پہلے تھی' نہ بعد میں باقی رہی۔

درحقیقت بادشاہت کا ادارہ ایک دفاعی اور حفاظتی انتظام تھا۔ بادشاہت کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے علاقے کا دفاع اور اپنے عوام کی حفاظت کرے۔ جو بادشاہتیں زرعی ترقی اور جاگیرداری نظام پر نہ کھڑی ہوں وہ صحیح معنوں میں بادشاہتیں ہوتیں ہی نہیں۔ اسی لئے آج کی عرب بادشاہتیں محض برائے نام ہیں۔ پہلے وہ برطانوی سامراج کی دلال تھیں' آج امریکی سامراج کی گماشتہ ہیں۔ یہ طفیلی بادشاہتیں ہیں' ان کی جڑیں اپنی زمین اور اپنے عوام میں نہیں۔ اسی لئے وہ نہ تو اپنے علاقوں کا دفاع کر رہی ہیں اور نہ اپنے عوام کی حفاظت۔ اسرائیل ان جعلی عرب بادشاہتوں کی کمزوری سے پیدا ہُوا اور برقرار ہے۔ سامراجی مقاصد کو آگے بڑھانے میں اسرائیل اور عرب بادشاہتیں باہم رفیق ہیں۔

خیر' پنجاب میں جاگیرداری تھی نہ بادشاہت۔ اس ایک حقیقت نے پنجاب کے مزاج پر بہت گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ جاگیرداری اور بادشاہت اونچ نیچ پیدا کرتی ہیں۔ پنجاب میں عملاً مساوات نافذ تھی۔ ہڑپہ تہذیب کے ایک جیسے گلی محلے اور مکانات اس کا تاریخی ثبوت ہیں۔ اس مساوات کا زندہ ثبوت پنجابی زبان ہے جسے وہ درباری جی حضوری چھُو کر نہیں گزری جو بحضور فیض گنجور' قبلہ و کعبہ' ابا حضور' بندہ پرور' آپ' جناب کے بغیر ایک قدم نہ چلنے والی اردو کا خاصہ ہے۔ آج اگر

پنجاب میں ملتان اور دریائے سندھ کے آس پاس کے اضلاع کی بولی میں ایک منکسرانہ درباری رنگ پایا جاتا ہے یابقیہ پنجاب نے "مولاجٹ اور نُوری نت" کا جارحانہ لہجہ اپنا لیا ہے تو یہ سب انگریزوں کے بعد ہُوا ہے جنھوں نے اپنے نو آبادیاتی مقاصد کے تحت ہمیں اپنے کارخانوں کے لئے خام مال پیدا کرنے پر لگا دیا اور اس سلسلے میں ایک زبردست نہری نظام جاری کر کے یہاں بظاہر زراعت کو ترقی دی لیکن دراصل جاگیردارانہ معاشرت کی بنیادیں رکھ دیں۔

انگریزوں نے پہلے تو ۱۸۷۰ء میں سرہند کینال کو بڑا کیا۔ پھر ۱۸۷۶ء میں مادھوپور ہیڈورکس قائم کر کے نہر اپر باری دو آب کو موجودہ شکل دی۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں اپر چناب بنائی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان انہوں نے اپر جہلم، لوئر باری دو آب اور لوئر چناب نکالیں۔ ۱۹۳۰ء میں ستلج ویلی پراجیکٹ تعمیر ہُوا۔ حویلی اور تھل کی نہروں کو چھوڑ کر باقی نہریں ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ مکمل ہوئیں۔ اس وضاحت سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں زراعت کی موجودہ شکل اور جاگیردارانہ معاشرت زیادہ دیر کا نہیں بلکہ ماضی قریب کا واقعہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پنجابی جاگیردار انگریز کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے برعکس جاگیردار کبھی پنجابی عوام کا روایتی قائد نہیں رہا۔ سرزمین پنجاب میں جاگیرداروں کی قیادت اوپر سے نافذ کی گئی تھی۔ چنانچہ جب ہم لوگوں نے ۱۹۶۷ء میں پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے عوام کو جاگیرداری کے خلاف اٹھنے کی دعوت دی تو دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پنجاب، خصوصاً اس کے وسطی اضلاع نے، اپنے سروں سے جاگیردارانہ قیادت کا جُوا اس حوصلے سے اتار پھینکا کہ بڑے بڑے تخت گرا دیئے اور بڑے بڑے تاج اچھال دیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس جماعت کے سر پر بیٹھے ہوئے سندھی وڈیروں نے اپنے احساسِ تنہائی کو کم کرنے کے لئے پنجاب کے پٹے پٹائے جاگیرداروں کو چوم چاٹ اور جھاڑ پونچھ کر دوبارہ اقتدار کی مسندوں پر لا بٹھایا تاکہ اپنے طبقاتی مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

پنجاب کے جاگیرداری نظام کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ انگریزوں نے یوپی اور سندھ کے برعکس پنجاب میں زمین کی ملکیت جاگیردار کو منتقل نہ کی تھی۔ دراصل انگریز یہاں ایک "نو آبادیاتی جاگیرداری" قائم کرنا چاہتا تھا جس میں سیاسی نظام اور نظم و نسق کی کنجی تو نو آبادیاتی حاکم کے پاس ہو لیکن لگان اکٹھی کرنا جاگیردار کا کام ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوپی کا زمیندار اور سندھ کا وڈیرا تو اپنے عوام کا لیڈر بن گیا کیونکہ زمین کی ملکیت نے اسے سیاسی نظام اور نظم و نسق

میں عمل دخل دے دیا تھا اور یوں قیادت کی ذمہ داری بھی اس کے سر ڈال دی تھی۔ لیکن پنجاب میں جاگیردار کی حیثیت مالک کی تھی ہی نہیں۔ یہاں زمین کا مالک تاجِ برطانیہ ہی رہا' جاگیردار کی حیثیت "مزارعِ اول" کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں ڈپٹی کمشنر' کالونی افسر اور کینال افسر "مائی باپ" جیسے ان القابات سے نوازے جانے لگے جو یوپی اور سندھ میں تعلق داروں اور وڈیروں سے مخصوص تھے اصولاً پنجابی جاگیرداروں سے حکومت جب چاہے زمین واپس لے سکتی ہے۔

۱۹۱۳ء میں کالونائزیشن آف لینڈ ایکٹ منظور ہُوا تو پنجاب کے مشرقی علاقوں سے کاشتکاروں نے مغربی اضلاع کی طرف ہجرت کرنی شروع کر دی جہاں نہری نظام نے زراعت کے نئے امکانات پیدا کر دیئے تھے۔ انبالہ' رہتک' حصار' جالندھر اور ہوشیار پور وغیرہ کے محنتی اور حوصلہ مند کسانوں نے شیخوپورہ' فیصل آباد اور ساہیوال جیسے کالونی اضلاع کے جنگلوں اور خرابوں کو لہلہاتے کھیتوں میں بدل دیا۔ ان علاقوں کی آباد کاری کا سلسلہ قیام پاکستان تک جاری رہا۔ پھر ایک لاکھوں مہاجر مشرقی پنجاب سے بے گھر ہو کر ان اضلاع میں چلے آئے۔ مہاجرین کو از سرِ نو زندگی کا سامان کرنا تھا۔ انہوں نے ہر طرح کی معاشرتی جکڑ بندیوں کو بالائے طاق رکھ کر زبردست تہذیبی' ثقافتی اور سماجی جرأت کا مظاہرہ کیا اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی سرتوڑ لیکن کامیاب کوشش کی۔ اس طرح پنجاب کے کالونی علاقوں میں جاگیرداری نظام کی جڑ نہ لگی۔ البتہ دریائے سندھ اور صوبہ سندھ کے آس پاس کے علاقے میں اس نے اچھا خاصا زور پکڑ لیا۔ چنانچہ سر خضر حیات' نواب کالاباغ اور نواب گورمانی جیسے لوگ اسی علاقے سے ابھرے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پنجاب کے اس علاقے کے جاگیرداروں کی حیثیت گورنروں کی تھی جب کہ دوسرے علاقوں کے جاگیردار محض ڈپٹی کمشنروں کا مقام رکھتے تھے تو غلط نہ ہو گا۔

پنجاب کے جاگیردار وہ نو آبادیاتی کردار تو ادا کرتے رہے جو ان کے خالق انگریزی راج نے انہیں سونپا تھا، انہوں نے یہاں کے عوام پر خوب خوب ظلم ڈھایا' اس دھرتی سے بار بار غداری کی جس کے صلے میں انہیں سیاسی اقتدار اور معاشی استحصال کے بہت مواقع ملے لیکن وہ کبھی پنجابی عوام کا دل نہ جیت سکے۔ یہ بجا ہے کہ آج بھی پنجاب کی سیاست پر جاگیردار ہی چھائے ہوئے ہیں اور چند علاقوں میں تو ان کا جبر ہمارے عوام کا خاص طور پر صبر آزما رہا ہے لیکن اب یہ حالات بھی پیدا ہو رہے ہیں کہ جس طرح ہمارے کسان اپنی کھیتی کا رس چوس لینے والی سُنڈیاں مارتے ہیں وہ مزارعوں' کاریگروں' مزدوروں' دکانداروں' چھوٹے تاجروں' قومی صنعت کاروں اور ترقی پسند دانش

وروں کے ساتھ مل کر پنجاب کی سیاست کا خون چوسنے والی جاگیردار سُنڈیوں کا بھی قلع قمع کر دیں۔

میں نے جاگیرداری اور جاگیرداروں پر اتنے الفاظ صرف اس وجہ سے خرچ نہیں کئے کہ میرے دل و دماغ میں ان کے خلاف بغض بھرا ہے۔ یقیناً میں انہیں پنجاب اور پاکستان کے عوام کا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہوں لیکن پنجاب میں قیادت کے فقدان پر بحث کرتے ہوئے ان کا تفصیلی ذکر اس لئے ضروری بلکہ ناگزیر تھا کہ انگریزوں کے وقت سے ہم نے جو تاریخ پڑھی ہے اس سے قیادت کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں پیدا ہُوا وہ جاگیرداری نظام اور اس سے پُھوٹنے والی بادشاہت سے مخصوص ہے۔ اوپر سے ہم نے یہ تاریخ پڑھی بھی انگریزی یا اردو میں ہے۔ دراصل انگریز نے ہم سے صرف پنجاب نہیں پنجابی بھی چھین لی تھی۔ زبان چھن جانے کے بعد ہم لوگ پنجابی کہلا ہی نہ سکتے تھے، ہم تو محض پنجاب کے باسی (DOMICILE) بن کر رہ گئے تھے۔ انگریز نے آتے ہی ۱۸۵۰ء میں پنجابی زبان کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یوپی اور اودھ سے جو بھیّا فوج اور نوکر شاہی انگریز کی رفیق بن کر یہاں آئی تھی اس کی مدد سے اس نے پنجابی قومیت کی بنیادیں ڈھادی تھیں۔ پھر دیوناگری، فارسی اور گورمکھی رسم الخط کے حوالے سے اس نے پنجابی ہندو، پنجابی مسلم اور پنجابی سکھ کو تقسیم کر دیا تھا۔

اب آیئے اس تاریخ کی طرف جو ہم نے پڑھی اور سمجھی ہے۔ صدیوں تک تاریخ کے تھپیڑے سہنے اور حملہ آوروں کی زد میں رہنے سے پنجاب مسلسل سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا۔ جس طرح ضرورت سے زیادہ استحکام جمود پیدا کر دیتا ہے اسی طرح ایک حد سے زیادہ عدم استحکام بے یقینی پیدا کر دیتا ہے جو بڑھتے بڑھتے بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہتا۔ یہی حال پنجاب کا ہوا ہے۔ صدیوں کے عدم استحکام نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ اپنی تمام تر قوتِ حیات کے باوجود جو اکثر و بیشتر کناروں سے چھلکتی رہتی اور بڑھکوں اور بھبکیوں کی شکل میں ظاہر ہوتی لہٰذا دوسروں کو جائز طور پر بہت بری لگتی ہے، پنجاب کے اندر اپنے بارے میں ایک بے یقینی اور بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ انگریزوں کی پڑھائی ہوئی اور ہماری جانی پہچانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس بے یقینی اور بے اعتمادی نے آج کے دور میں جہاں ہمارے اندر مضبوط مرکز کی خواہش، تھانے دارانہ سیاست کی گنجائش اور ٹھیکے دارانہ حب الوطنی پر اصرار کو جنم دیا ہے وہاں یہ ہماری صفوں میں قیادت کے فقدان پر بھی منتج ہوئی ہے۔ جب پنجاب نے صدیوں تک یہ دیکھا کہ اس کا

سیاسی نظام باہر سے آنے والے حملہ آوروں کا راستہ نہیں روک سکا اور اس کی جان ' مال ' عزت و آبرو کی حفاظت نہیں کر سکا تو آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ قیادت کا منصب حملہ آوروں ہی کو زیب دیتا ہے۔ حملہ آوروں کی دھاک اور دہشت اہلِ پنجاب پر اس طرح بیٹھ گئی کہ اگرچہ اب وہ ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں ' اس ملک کی آبادی کا ۶۳ فیصد ہیں اور ملکی فوج اور نوکر شاہی میں ان کی عددی اکثریت ہے مگر وہ گذشتہ چالیس صدیوں کی واردات کو اپنی نفسیات سے خارج نہیں کر سکے جو ان کے وجود میں اس طرح گہری اتر گئی ہے جیسے پانی میں پارا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ تاریخ کے تشدد کا یہ اثر پاک پنجاب پر اس قدر گہرا کیوں ہے اور اس کی چھاپ بھارتی پنجاب پر کیوں اتنی نمایاں نہیں۔ بات اتنی ہے کہ جو زمین کے بیٹے نہیں بنتے اور اپنی زبان اور ثقافت کو ترک کر دیتے ہیں وہ قائدانہ صلاحیتوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ آج سکھوں کے پنجاب میں قیادت کا خلا نہیں لیکن مسلمانوں کے پنجاب کی حالت کیا ہے؟ آج مسلمانوں کا پنجاب قیادت کے لئے اپنی حدود سے باہر دیکھنے کا عادی نظر آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ' پنجاب کے مسلمان یہ تو ہرگز نہیں سوچتے کہ قیادت چین ' روس ' ایران ' افغانستان یا بھارت سے آئے گی لیکن یہ توقع ضرور کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کے اندر دوسرے صوبوں سے آئے گی یا اس پر کسی نہ کسی حد تک درآمد کی مہر ضرور لگی ہو گی۔ وہ اندر ہی اندر انتظار کرتے ہیں کہ قیادت ایوب خان کی طرح سرحد سے یا ذوالفقار علی بھٹو کی طرح سندھ سے آ جائے۔ مسلمان پنجابی کا مسئلہ یہ ہے کہ پنجاب میں رہنے کے باوجود وہ پنجابی نہیں۔ جو شخص پنجابی بولتا نہیں ' پڑھتا نہیں ' لکھتا نہیں کیا محض اس لئے پنجابی کہلا سکتا ہے کہ پنجاب میں اس کے پاس زمین ' مکان یا نوکری ہے۔ نہ وہ پنجابی کہلا سکتا ہے اور نہ وہ پنجاب کی قیادت کر سکتا ہے۔

دوسرے صوبوں کے بہت سے کرم فرماؤں کی طرح بھٹو مرحوم بھی پنجاب کو زِچ کرنے کے لئے ' یا اس کے غیر سیاسی رویئے سے تنگ آ کر ' طعنے اور توہین پر اتر آیا کرتے تھے۔ ان کے بقول مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سوا پنجاب نے اپنا کوئی قائد پیدا نہ کیا تھا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب کی ماؤں نے "نر بچہ" جننا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ویسے جو لوگ اپنی زمین اور زبان سے محبت نہ کریں وہ اسی طرح کے طعنے اور توہین کے مستحق ہوتے ہیں۔

اب کچھ عرصے سے پنجاب کے عوام میں قیادت کے خلا کا احساس بڑھتا جا رہا

ہے البتہ اس خلا کو پر کرنے کے خواہش مندوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ پنجابی عوام بقائمی ہوش و حواس کسی بزدل اور سازشی کے پیچھے نہیں چل سکتے' وہ خود بھی جیدار اور صاف گو ہیں' وہ کسی جیدار اور صاف گو شخص ہی کو اپنا قائد مان سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو ایوب خاں اور ذوالفقار علی بھٹو ۔۔۔ دونوں کی طاقت کا گڑھ پنجاب ہی تھا لیکن جب پنجاب کو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ایوب کی پامردی پر شک ہوا اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد بھٹو کی بات کا یقین نہ رہا تو اس نے دونوں کو راج گدی سے اتار دیا۔

مروجہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں نے یہ رائے زنی بھی کی ہے کہ پنجاب نے براہ راست حکومت کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا ہے اور وہ بادشاہ کے بجائے وزیر کا کردار زیادہ پسند کرنے لگا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ حکومت میں پہلی پوزیشن کے بجائے دوسری پوزیشن پر ہونا کم خطرناک ہوتا ہے۔ اس تجزیئے کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان کے قیام کے بعد واقعی پنجاب نے براہ راست سیاسی حکومت یا "بادشاہی" کرنے کے بجائے نوکر شاہی اور فوج میں اپنی اکثریت پر قانع رہتے ہوئے "سیکنڈ فڈل" یا "داشتہ آید بکار" بن کر ہی وقت کاٹا ہے۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ گو پاکستان کی سربراہی پنجاب کو حاصل نہ تھی لیکن فوج اور نوکر شاہی میں اپنے زور کی بدولت پنجاب ہی سربراہوں سے اپنی پسند کے فیصلے کراتا رہا ہے۔ یہ درست نہیں۔ اللہ جنت نصیب کرے نواب زادہ لیاقت علی خان جیتے جی پاکستان کی باگیں امریکی سامراج کے ہاتھ میں دے گئے تھے' پاکستان کے بیشتر فیصلے تو سامراجی قوتوں اور یہاں کے جاگیرداروں اور گماشتہ سرمایہ داروں نے کئے ہیں۔ پنجابیوں کو تو جب بھی موقع ملا ہے' خواہ ووٹ ڈالنے کا کھلا موقع ہو' انہوں نے ترقی پسندانہ فیصلے کئے ہیں۔

پاکستان کے پہلے گیارہ سال جمہوری دور کہلاتے ہیں جس کے دوران پاکستان میں پارلیمانی نظامِ حکومت قائم تھا۔ اس نظام میں حکومت کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ تیرہ مہینے تک چودھری محمد علی اور دس مہینے کے لئے فیروز خان نون اس عہدے پر فائز رہے۔ ان دو پنجابیوں نے گیارہ سال کے عرصے میں کل تیئیس ۲۳ مہینے پاکستان پر حکومت کی۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ کیا اور گیارہ سال تک بلا شرکتِ غیرے راج کیا۔ پھر ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان آ گئے جو تقریباً تین سال تک ایک ڈکٹیٹر کے طور پر مسندِ حکومت پر براجمان رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء کے اواخر میں ذوالفقار علی بھٹو تشریف لائے جو جولائی ۱۹۷۷ء تک برسراقتدار رہے۔ ان تینوں میں

سے ایک بھی پنجابی نہ تھا۔ گویا انیس سال کے اس عرصے میں خالصتاً غیر پنجابیوں نے حکومت کی۔
مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے پہلے تیس سال میں پنجابیوں نے صرف تیئیس ۲۳ مہینے براہِ راست سیاسی حکومت کی۔ اب اگر صدر ضیاء الحق ملک کے سربراہ ہیں تو وہ پنجاب کے نہیں بلکہ فوج کے نمائندے کے طور پر ہیں۔ بہرحال وہ پنجابی ہیں اور ان رویوں کے حامل ہیں جو تاریخ کے تشدد نے اہلِ پنجاب کے لاشعور میں مرتب کر رکھے ہیں اور جنہیں وہ ابھی تک اپنے وجود سے جھٹکنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکے۔ تو خیر، جب اہلِ پنجاب سیاسی طور پر خود ہی پیچھے ہٹ گئے اور براہ راست اقتدار میں آنے کے بجائے صرف فوج اور نوکر شاہی میں اپنی اکثریت پر قانع رہے یا دوسرے لفظوں میں بادشاہی کے بجائے وزارت کے کردار پر خوش تھے تب بھی پنجاب کو گالیاں ہی پڑتی تھیں لیکن جب سے ایک پنجابی برسراقتدار آیا ہے اور اس نے تھانیداری اور ٹھیکیداری کے اُس رویے کو براہِ راست عمل میں لانا شروع کر دیا ہے جس پر دوسرے صوبوں کی قیادت کو ہمیشہ اعتراض رہا ہے تو پنجاب کے خلاف شکایت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس ضرورت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے کہ پنجاب اپنے روایتی رویوں کو لاشعور سے شعور کی سطح پر لائے اور ان سے چھٹکارا پانے کی راہ نکالے مگر سوال یہ ہے کہ جب پاکستان کی تاریخ میں پنجاب نے اپنی آبادی کی کثرت اور قوت کی برتری کے باوجود اتنے تھوڑے عرصے کے لئے براہ راست سیاسی حکومت کی ہے تو پھر دوسرے صوبوں کو اس سے اتنی زیادہ شکایت کیوں کر پیدا ہو گئی؟

جواب یہ دیا جاتا ہے کہ پنجاب نے براہِ راست سیاسی حکومت بے شک کم کی ہے لیکن فوج اور نوکر شاہی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر بالواسطہ حکومت پر ہمیشہ اسی کا قبضہ رہا ہے اور اگر اس نے بلاواسطہ حکومت یا بادشاہی کے بجائے وزارت کا مقام اپنایا ہے تو اس "پاگل پن" میں بھی اس کی کوئی نہ کوئی "چال" ہے اگر پنجاب نے براہِ راست سیاست کو اپنایا ہوتا اور براہِ راست حکومت کی ہوتی تو دوسرے صوبوں سے پنجاب کا واضح تعارف ہو جاتا۔ پنجاب نے سیاست اور حکومت کے سلسلے میں اپنے آپ کو پردے میں رکھ کر اپنے آپ کو مشکوک بنالیا ہے۔

بہتر ہو گا کہ اس مسئلے کو ذرا گہرائی میں دیکھ لیا جائے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ فوج میں بے شک پنجاب کی اکثریت ہے لیکن تناسب کے اعتبار سے صوبہ سرحد کو پنجاب سے زیادہ حصہ ملا ہوا ہے پھر اگر سندھ اور بلوچستان کے لوگ فوج میں نہ ہونے کے برابر ہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ انہیں فوج میں بھرتی ہونے سے زبردستی روکا گیا تھا۔ اس کی بڑی

وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں کے لوگ کسی ایسی سرکاری ملازمت میں جاتے ہی نہیں جس میں انہیں اپنے علاقوں سے باہر جا کر کام کرنا پڑے۔ رہی فوجی ملازمت تو وہ اس کے لئے سرے ہی سے تیار نہیں ہوتے کیونکہ اس میں لازماً دور دراز کے علاقوں میں بھی جانا پڑ جاتا ہے۔ بے شک پاکستان کی حکومتوں اور فوج کے اربابِ اختیار کو چاہئے تھا کہ بھرتی کے معیار میں مناسب تبدیلیاں کر کے اور ابتداً علاقائی ملیشیا تشکیل دے کر سندھ اور بلوچستان کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں شامل کرتے تاکہ ہماری فوج صحیح معنوں میں قومی فوج بن جاتی لیکن نہ تو سندھی اور بلوچ قیادت نے بروقت یہ مسئلہ اٹھایا اور نہ مرکزی حکومت اور فوجی سربراہوں نے اس طرف توجہ دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اس تکلیف دہ حقیقت سے نظر نہیں چرائی جا سکتی کہ ہماری فوج محض پٹھانوں اور پنجابیوں کی فوج بن کر رہ گئی ہے اور اس میں عددی طور پر پنجابیوں کی اکثریت کی وجہ سے چھوٹے صوبوں کے لوگ اسے پنجابی فوج کے طور پر دیکھنے لگے ہیں۔ چھوٹے صوبے تو الگ رہے' جب پاکستان ثابت و سالم تھا تو اکثریتی صوبے مشرقی پاکستان میں بھی اسے پاکستانی کے بجائے پنجابی فوج ہی کہا اور سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر کل ڈھاکہ کے ہر دوسرے موڑ پر استادہ شہید مزار پر بنگالیوں کے قتلِ عام کا الزام "پنجابی فوج" کے ہی سر لکھا گیا تو آج سندھ اور بلوچستان کے سیاسی حلقے بھی فوج کو پاکستان سے نہیں پنجاب ہی سے منسوب کرتے ہیں۔ فوج میں پنجاب کی اکثریت سے دوسرے صوبوں کو یقیناً شکایت ہے اور یہ صورتحال ملک کے لئے مفید بھی نہیں لیکن یہ اکثریت خود ان صوبوں کے اپنے روایتی رویوں کی وجہ سے بھی پیدا ہوئی اور قائم رہی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سندھ اور بلوچستان کی اصل شکایت یہ ہے ہی نہیں کہ وہ فوج میں کیوں نہیں اور پنجابی اکثریت میں کیوں ہیں۔ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ انہیں فوج میں شامل ہونے سے کسی نے نہیں روکا۔ ان کی اصل شکایت یہ ہے کہ جب بھی ملک میں مارشل لاء لگتا ہے تو اقتدار خالصتاً فوج کے چند جرنیلوں کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتا ہے۔ جو پٹھان ہوتے ہیں یا پنجابی اور یوں سندھ اور بلوچستان کے لوگ، جنہیں فوج میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں' مارشل لاء کے دوران اقتدار میں شرکت سے قطعی محروم ہو جاتے ہیں۔ مارشل لاء کے دوران پنجاب اور سرحد کے عوام بے شک سندھ اور بلوچستان کے مقابلے میں کم اداس ہوتے ہیں کیونکہ انہیں حکمرانوں میں اپنے بھائی بند نظر آتے رہتے ہیں لیکن مارشل لاء کی وجہ سے جو سیاسی اور معاشی نقصان پورے ملک کو پہنچتا ہے اس میں وہ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ مارشل لاء کے سلسلے میں چھوٹے صوبوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ یہ بھی پنجاب والوں ہی کی ایما پر لگتا یا لگایا جاتا ہے۔ع اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے اسد' چھوٹے صوبوں کے سامراج دشمن قائدین کتنی آسانی سے یہ حقیقت نظرانداز کر جاتے ہیں کہ ہمارے جیسے چھوٹے ملکوں میں مارشل لاء بیرونی طاقتوں کے عالمی اور سامراجی مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے لگوایا جاتا ہے' اس میں بے چارے عوام کو کون پوچھتا ہے۔ رہے سامراج کے گماشتے جو مارشل لاء کی راہ ہموار کرتے ہیں تو کیا وہ صرف پنجاب ہی میں پائے جاتے ہیں' کیا ان کی تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں اور ہمارے یہاں سندھ' سرحد اور بلوچستان میں کوئی قلت ہے؟

فوج میں پنجاب کی اکثریت کے باعث چھوٹے صوبوں کو جو شکایت ہے اس کا دوسرا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ملک کی مجموعی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ فوج پر خرچ ہو جاتا ہے اور چونکہ فوج میں پنجاب کی اکثریت ہے اس لئے فوج پر اٹھنے والے اخراجات کا بڑا حصہ' بالواسطہ ہی سہی' بالآخر پنجاب کو منتقل ہو جاتا ہے۔ اس شکایت کی حقیقت پر ذرا آگے چل کر بات ہوگی۔

تیسری اہم شکایت یہ ہے کہ فوجیوں کو جو زمینیں ملتی ہیں وہ خاص طور پر سندھ میں دی جاتی ہیں اور فوج میں پنجابیوں کی اکثریت ہے اس سے سندھ کے لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ پنجابی آہستہ آہستہ ان کی زمینوں پر قابض ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ سندھ میں مرکزی حکومت کے سول اور ملٹری ملازموں کو بھی بہت زمین دی گئی اور ان کی اکثریت اردو بولنے والے مہاجرین پر مشتمل تھی۔ مگر ہمارے سندھی بھائی ان زمینوں کو بھی پنجاب ہی کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

یہاں سرکاری ملازمتوں میں پنجاب کی اکثریت کے مسئلے کو ذرا تفصیل سے دیکھ لیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔ اول تو اس بات میں افسانہ زیادہ اور حقیقت کم ہے کہ پنجاب کو سول سروس میں اکثریت حاصل ہے۔ آج بھی پانچ کروڑ کے اس صوبے کو ان ملازمتوں میں اس کی آبادی کے لحاظ سے حصہ نہیں ملا ہوا۔ پاکستان بنا تو لاکھوں سرکاری ملازمین مسلم اقلیت کے صوبوں سے پاکستان چلے آئے تھے اور بڑی دیر تک سول ملازمتوں پر انکا تسلط رہا جو اب تک قائم ہے۔

دوم' اگر یہ ملازمتیں صلاحیت اور کھلے مقابلے کی بنیاد پر دی جائیں تو پنجاب کے امیدواروں کو اس سے کہیں زیادہ ملازمتیں ملنی چاہئیں جو آج انہیں حاصل ہیں۔ پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں' سرکاری ملازمتیں صرف سول سروس تک تو محدود نہیں۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان'

نیشنل بنک آف پاکستان ' زرعی ترقیاتی بنک 'صنعتی ترقیاتی بنک ' پبلک 'انشورنس کارپوریشن آف پاکستان 'نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن جیسے بیسیوں ادارے بھی توملک میں موجود ہیں جن کی ملازمتوں میں پنجاب کو اس کی آبادی کے لحاظ سے نہایت ہی قلیل نمائندگی حاصل ہے۔ اور یوں پاکستانی معیشت پر اس کا اختیار اس کی آبادی کے اعتبار سے انتہائی قلیل ہے۔ اسی طرح مرکزی پُول کی ملازمتوں میں قیام پاکستان سے آج تک پنجاب کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔

بہرحال سول ملازمین چونکہ تحصیل 'ضلع اور سیکرٹریٹ کی سطح پر عوامی اور سیاسی اہمیت کے حامل منصبوں پر فائز ہوتے ہیں اس لئے ان ملازمتوں میں پنجاب کی عددی بہتات زیادہ تنقید کا نشانہ بنتی ہے۔ لیکن میری اس سلسلے میں بھی یہ رائے ہے کہ فوج میں پنجاب کی اکثریت کی طرح سول ملازمتوں میں پنجاب کی اکثریت کے بارے میں اصل شکایت کچھ اور ہے۔

سول سروس خواہ پنجابیوں پر مشتمل ہو یا پٹھانوں 'سندھیوں اور بلوچوں پر ' وہ انگریزوں کے دور کی نوکر شاہی ہو یا مغلوں کے دور کی 'اس کا کام حالات میں تبدیلی لانا نہیں بلکہ نظم و نسق قائم کرنے کے نام پر حالات کو "جُوں کا تُوں" برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ جب چھوٹے صوبوں کے لوگ اپنے علاقوں میں پنجابی افسروں کو متعین پاتے اور ساتھ ہی یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے مسائل حل نہیں ہو رہے تو وہ بڑی آسانی سے سارا الزام پنجابی نوکر شاہی پر ڈال سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پنجابی افسروں کے بجائے مقامی باشندے ہی ان منصبوں پر فائز ہوتے تو شاید وہ بھی حالات میں زیادہ تبدیلی نہ کر پاتے کیونکہ جب تک اوپر سے سیاسی نظام اور انتظامی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں نہیں ہوتیں اور نیچے سے لے کر اوپر تک لوگوں کی نمائندہ مقامی اور سیاسی حکومتیں قائم نہیں ہوتیں حالات میں تبدیلی لانے کا کام اکیلی نوکر شاہی کر ہی نہیں سکتی۔ بلکہ جب مقامی اور سیاسی حکومتیں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہی ہوتی ہیں تب بھی نوکر شاہی کا کردار یہی ہوتا ہے کہ قاعدے قانون کے نام پر اس تبدیلی کی رفتار کو مدھم سے مدھم تر کرتی رہے۔

تو کیا سول ملازمتوں کے سلسلے میں چھوٹے صوبوں کی یہ شکایت بے جواز ہے؟

نہیں۔ اگر پنجابی افسروں کے بجائے 'جن میں پنجابی تھانے دار خاص طور پر شامل ہیں' چھوٹے صوبوں میں وہاں کے مقامی لوگ ہی افسر اور تھانے دار مقرر ہوں تو دو فائدے مرتب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مقامی زبان اور ثقافت سے بہتر طور پر واقف ہونے کی بنا پر مقامی افسر اور تھانے دار اپنے

لوگوں کو اپنی بات اور اپنا موقف بہتر طریقے سے سمجھا سکیں گے اور ان کی بات بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ دوسرے مقامی لوگ ان مقامی افسروں اور تھانے داروں کا بہتر طور پر محاسبہ کر سکیں گے۔ ایک اضافی فائدہ یہ ہو گا کہ پنجاب کو خواہ مخواہ گالی نہیں پڑے گی۔ اگر مقامی افسر اور تھانے دار مقامی آبادی کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوں گے تو گالی کا رخ بھی انہی کی طرف ہو گا۔

اب ایک قدم اور آگے چلئے۔ فوج کی طرح نوکر شاہی میں پنجاب کی اکثریت کے بارے میں بھی چھوٹے صوبوں کا تاثر یہ ہے کہ اول تو پاکستان میں انتظامیہ پر بے انتہا خرچ ہوتا ہے' اوپر سے یہ انتظامی خرچ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس خرچ کا بہت بڑا حصہ بھی بالآخر پنجاب ہی کو منتقل ہو رہا ہے۔ دوسرے صوبے یہ سمجھتے ہیں کہ بے شک پنجاب نے براہ راست سیاسی حکومت بہت قلیل مدت کے لئے کی ہے لیکن فوج اور نوکر شاہی میں اکثریت کے باعث پاکستان پر بالواسطہ پنجاب ہی کا تسلط رہا ہے اور قومی خزانے کا بڑا حصہ فوج اور نوکر شاہی کی وساطت سے پنجاب ہی کی ترقی پر خرچ ہُوا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ خواہ پنجاب کے پانچ کروڑ عوام نے براہِ راست ان کا استحصال نہ کیا ہو لیکن پنجاب کے عوام کو اس بالواسطہ استحصال سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے' وہ بے قصور سہی لیکن اتنے بے قصور بھی نہیں۔

یہ اعتراض کرتے ہوئے چھوٹے صوبے انتہائی آسانی سے اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ بالواسطہ حکومت کرنے سے پنجاب کے چند تھانے داروں' افسروں یا چودھریوں کو ضرور فائدہ ہُوا ہو گا لیکن جہاں تک اس کے پانچ کروڑ غریب اور محنتی عوام کا تعلق ہے وہ ان گالیوں کے ہر گز سزاوار نہیں جن سے چھوٹے صوبوں کے قائدین نے انہیں مسلسل اور متواتر نوازا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ پنجاب کے عوام کو دوسرے صوبوں پر مسلط پنجابی تھانے داروں' افسروں اور چودھریوں کی لوٹ کھسوٹ سے ضرور کچھ نہ کچھ حصہ ملتا ہے۔ مگر یہ حصہ اس سے زیادہ نہیں کہ آپ کا کوئی سمگلر رشتہ دار آپ کو پلاسٹک کی ایک صابن دانی تحفے میں دے دے۔ لاہور کی چند چمچماتی سڑکوں اور فیصل آباد کی چند دھواں اگلتی چمنیوں سے پنجاب کی ترقی کا اندازہ کرنے والے پنجاب کے ان ہزاروں دیہات کی طرف کیوں نہیں دیکھتے جہاں بسنے والی میری مائیں اور بہنیں آج بھی دس دس بارہ بارہ میل پیدل چل کر اپنے بچوں کو پلانے کے لئے کیڑوں اور جونکوں والا وہ پانی بھر کے لاتی ہیں جو راتوں کو سؤروں اور کتّوں نے پیا ہوتا ہے۔

مگر یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ جب پنجاب کے پانچ کروڑ عوام نے سندھ' سرحد اور

بلوچستان کے عوام کا استحصال نہیں کیا اور اگر وہ بھی انہی کی طرح یا ان سے کوئی ایک آدھ درجہ کم غریبی ' بے روز گاری ' جہالت اور بیماری سے دوچار ہیں تو پھر انہیں مسلسل اور متواتر گالی کیوں پڑتی ہے؟

اس کی وجہ ایک ہے۔ پنجاب کا مقدمہ مضبوط ہے لیکن اس کا وکیل کوئی نہیں۔ پنجاب ہر بار اپنا مقدمہ اس لئے ہار جاتا ہے کہ اس نے اپنا وکیل ہی مقرر نہیں کیا۔ اور جس طرح عدالت ہر اس سائل کو جس کا کوئی وکیل نہ ہو اپنی طرف سے سرکاری وکیل مہیا کر دیتی ہے ' اسی طرح پنجاب کے وکیل کی عدم موجودگی میں پنجابی نوکر شاہی اور فوج اس کے سرکاری وکیل کی کرسی سنبھال لیتی ہے۔ چنانچہ جب بھی چھوٹے صوبوں کی شکایت ایک حد سے بڑھتی ہے تو پنجاب کے عوام سے پوچھے بغیر نوکر شاہی اور فوج پنجاب کی طرف سے دوسرے صوبوں سے بات کرنے چل نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان اداروں کو جن ہتھیاروں اور ہتھکنڈوں سے کام لینے کی تربیت حاصل ہوتی ہے وہ انہی کو استعمال میں لانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسرے صوبوں سے اپنی سیاسی قیادت کے ذریعے ' سیاسی زبان میں بات کرنے کے بجائے بار بار قاعدے قانون اور لاٹھی گولی کی زبان میں بات ہوتی ہے تو بات بننے کے بجائے لازماً بگڑ جاتی ہے۔

یہی کچھ اس وقت ہُوا جب مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے عموماً اور پنجاب سے خصوصاً شکایت پیدا ہوئی۔ ہمارے بنگالی بھائیوں نے اس صورتِ حال کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ اُس وقت ایوب خان کی حکومت تھی یا پھر یحییٰ خان کی جو دونوں پٹھان تھے اور دونوں مطلق العنان حکمران تھے۔ اس وقت سیاسی فیصلے واضح طور پر ان دو پٹھانوں کے ہاتھ میں تھے مگر بنگالیوں نے طعن و توہین کا نشانہ "شالے پنجابی" ہی کو بنایا۔ وجہ سیدھی ہے اور اس چھوٹے سے لیکن قابلِ ذکر واقعے سے واضح ہو جاتی ہے کہ جب ان کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تو جسٹس ایس اے رحمٰن جج مقرر ہوئے اور مسٹر منظور قادر وکیل جو دونوں پنجابی تھے۔ اسی طرح وہاں آرمی ایکشن شروع ہُوا تو اس موقع پر دو جرنیل ' ٹکا خان اور امیر عبداللہ خان نیازی بھیجے گئے۔ وہ دونوں بھی پنجابی تھے۔ یہی حال افسروں کا تھا۔

یہ صورتِ حال ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی جاری رہی۔ چنانچہ مختلف موقعوں پر تینوں چھوٹے صوبوں میں موصوف نے جتنے بھی چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس متعین کئے وہ سب کے سب پنجابی تھے۔ میں نے ان کے دورِ اقتدار میں اس پر شدید احتجاج کیا تھا اس لئے کہ جب چھوٹے

صوبوں میں لوگوں کے کام رُکتے تھے اور وہ اپنی فائلوں کے اوپر ایک پنجابی چیف سیکرٹری کو بیٹھا پاتے تھے تو گالی بھٹو صاحب یا ان کی نوکر شاہی کو نہیں بلکہ پنجاب کو دیتے تھے۔ اسی طرح جب ان پر تشدد ہوتا تھا اور وہ اپنے اوپر ڈنڈے برسانے والی پولیس کے کندھوں پر ایک پنجابی انسپکٹر جنرل کو بیٹھا دیکھتے تھے تو گالی کا رخ بھٹو صاحب یا ان کی پولیس نہیں پنجاب کی طرف ہوتا تھا۔ یاد رہے کہ چیف سیکرٹری اور آئی جی کی سطح کے افسر صوبائی حکومتوں کے نہیں' مرکز کے ماتحت ہوتے ہیں۔

ایوب خان' یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے انیس سالہ دور میں تمام سیاسی فیصلے غیر پنجابی حکمرانوں کے ہاتھوں میں مرکوز تھے مگر پنجابی افسر اور تھانے دار اِن مطلق العنان حکمرانوں کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور پاکستان کو چلانے اور قائم رکھنے کے نام پر چھوٹے صوبوں کے عوام کو دبانے کے لئے ہمہ وقت دستیاب رہتے تھے۔ اس سے چھوٹے صوبوں میں پنجاب کے خلاف نفرت نہیں تو اور کیا پیدا ہوتا؟

اور پھر جب پاکستان میں ایک ایسا مارشل لاء لگا ——— جس کے سربراہ ایک پنجابی تھے تو صورت حال اور بھی نازک ہو گئی چنانچہ جب سندھ سے محرومی کی صدا ایک احتجاج بن کر اٹھی اور پنجابی اکثریت کی حامل فوج اور نوکر شاہی نے اس احتجاج کو اپنے مخصوص ہتھیاروں اور ہتھکنڈوں سے دبانے کی کوشش کی تو پنجاب کے خلاف شکایت بڑھتے بڑھتے نفرت کی حدوں کو چھونے لگی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اہل پنجاب کو دیکھنا ہے کہ وہ روایتی طور پر کن ناپسندیدہ رویوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خود احتسابی کا یہ لمحہ جس قدر جلد طلوع ہو جائے پاکستان کی سلامتی اور پنجاب کی سرخروئی کے لئے اتنا ہی بہتر اور مبارک ہے۔

رہی یہ بات کہ دوسرے صوبوں کے لوگ پنجاب میں بات کس سے کریں کیونکہ پنجاب کا کوئی قائد نہیں تو میری ان سے گذارش ہے کہ وہ پنجاب کے سلسلے میں ایک بات بھول جائیں' پنجاب کے جاگیردار نہ تو پہلے پنجاب کے قائد تھے اور نہ آئندہ ہوں گے۔ انہیں انگریزوں نے ایک جعلی اور غیر فطری طریقے سے پنجاب کی سیاست پر ٹھونسا تھا۔ پنجاب کی اصل طاقت اس کے ترقی پسند عوام ہیں اور انہی کے نمائندوں سے دوسرے صوبوں کی عوام دوست قیادت کو بات کرنی ہوگی۔

پانچواں باب

وفاقیت کے تقاضے

جب ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ ٹوٹ گیا اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو کچھ عرصے کے لئے پنجاب سمیت رہے سہے پاکستان میں یہ احساس برقرار رہا کہ ملک کے لئے آئندہ جو سیاسی ڈھانچہ بھی مرتب ہو اُسے لازماً وفاقی ہونا چاہئے' اس میں صوبوں کو ایسے حقوق حاصل ہونے چاہئیں کہ ہر صوبہ اپنے اندرونی معاملات کی حد تک خود مختار ہو اور اپنی زبان' ثقافت' رہن سہن اور رسم ورواج کو حسبِ خواہش ترویج اور ترقی دے سکے۔

۱۹۷۳ء کا دستور اسی احساس کا آئینہ دار تھا۔

اُس وقت پاکستان کے ایک چھوٹے صوبے سندھ سے تعلق رکھنے والے جناب ذوالفقار علی بھٹو ملک کے وزیر اعظم تھے۔ ان سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ ۱۹۷۳ء کے وفاقی دستور پر دیانت داری اور سنجیدگی سے عمل کریں گے۔ آخر یہ دستور انہی کے دور حکومت میں بنا تھا اور وہ ہمیشہ سے کہتے آئے تھے کہ صوبوں کو جائز حقوق دینے سے مرکز کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنی کتاب "عظیم المیہ" کے صفحہ ۵ پر کہا تھا۔

"تاریخی' نسلی اور لسانی وجوہات کی بنا پر پاکستان کے لئے وفاقی ڈھانچہ ہی موزوں ترین ہے۔ پاکستان کا المیہ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ گو وفاقیت ہی ہمارے حالات کے لئے موزوں ہے پھر بھی گذشتہ ۲۳ سال میں پاکستان صرف نام کی حد تک وفاق کہلاتا رہا۔ اس صورت حال کا نتیجہ تباہ کن نکلا۔

وفاقیت کی روح اور بقائے باہمی کے اصولوں کو ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور مضبوط مرکز کے نام پر صوبوں کے اختیارات کو اس حد تک کم کر دیا گیا کہ وہ نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔"

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اِن الفاظ کے مصنف نے اپنے دورِ حکومت میں ہُو بہُو وہی کچھ کیا جس پر وہ ہمیشہ اعتراض کرتے رہے تھے' خود اپنے ہاتھوں انہوں نے صوبوں کے اختیارات کو مضبوط مرکز کی بھینٹ چڑھایا اور یوں پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے "عظیم المیے" کی بنیاد رکھی۔ مثلاً مسٹر بھٹو کے عہد میں بلوچستان کی نمائندہ حکومت کو بلاجواز معطل کر دیا گیا۔ اس پر احتجاج کرتے ہوئے صوبہ سرحد کی نمائندہ حکومت نے از خود استعفیٰ دے دیا۔ مسٹر بھٹو نے ان دونوں صوبوں میں ضمنی انتخابات کی جادوئی چھڑی سے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو کامیاب کروایا اور وہاں اپنی پارٹی کی حکومتیں قائم کر دیں۔ اس ساری کارروائی میں پنجابی نوکر شاہی کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اُس وقت چھوٹے صوبوں میں چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے چونکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت پنجابیوں ہی کے ہاتھ میں دیئے جاتے تھے اس لئے ان صوبوں کے عوام نے پنجاب کو گالی دینے پر خود کو آمادہ اور مجبور پایا۔

اس وقت پنجاب میں ملک معراج خالد وزیر اعلیٰ اور میں وزیرِ خزانہ تھا۔ میں نے بھری کابینہ میں اِن واقعات پر احتجاج کیا جس پر گورنر کھر نے پوری کابینہ کو بلوایا اور مجھے سُنا سُنا کر مسٹر مختار اعوان اور مرحوم انور سمہّ کو سخت سُست کہنا شروع کر دیا۔ میں نے سارا الزام اپنے سر لیتے ہوئے کہا کہ میں یہ جاننے کا حق رکھتا ہوں کہ سرحد اور بلوچستان میں ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟ اس پر گورنر کھر نے مسٹر بھٹو سے میری باقاعدہ شکایت کی۔ مسٹر بھٹو نے بعد میں مجھے اس کا گِلہ دیا تو میں نے وضاحت کی کہ میری دانست میں پیپلز پارٹی کو چاہئے تھا کہ قیوم خان کی مسلم لیگ کے بجائے ولی خان اور بزنجو کی نیشنل عوامی پارٹی کو قریب لا کر مرکز میں وزارت بناتی' اس طرح ملک میں ترقی پسند طاقتیں متحد ہو کر بنیادی تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہو جاتیں' صوبوں میں بے چینی بھی پیدا نہ ہوتی اور نہ ہی مرکز اور صوبوں کے تعلقات خراب ہوتے۔

مگر سرحد اور بلوچستان کو تو چھوڑیئے کہ وہاں پیپلز پارٹی کمزور تھی' دستور کی صریح خلاف ورزیاں پنجاب میں بھی ہوتی رہتی تھیں جہاں پیپلز پارٹی کی واضح اکثریت تھی۔ مثلاً عبوری آئین کے تحت صوبے کی سربراہی اور عنانِ حکومت وزیر اعلیٰ کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تھی۔ لیکن سب نے

دیکھا کہ وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد تو یکسر بے اختیار ہیں اور گورنر غلام مصطفیٰ کھر کامل مختار۔ جب میں وزیر اعلیٰ بنا تو میں نے پوری کوشش کی کہ اختیارات وزیر اعلیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوں۔ اس طرح گورنر اور وزیر اعلیٰ کے درمیان اقتدار کی تقسیم تو صحیح بنیادوں پر ہو گئی لیکن پھر بھی کئی موقعوں پر، مثلاً مئی ۱۹۷۵ء کے دوران مری میں منعقد ہونے والی گورنرز کانفرنس میں، آئینی حقوق اور بجٹ اور پانی کی تقسیم کے بارے میں میرے اور مسٹر بھٹو کے درمیان اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا کہ اس کی دھمک دور دور تک جا پہنچی۔

تب میں نے جانا اور مانا کہ اگر پنجاب جیسے بڑے اور طاقتور صوبے کے ساتھ مرکز یہ سلوک کر سکتا ہے کہ اس کی انتظامیہ میں جا و بے جا دخل اندازی کرے اور اس کے آئینی اختیارات میں خواہ مخواہ ڈنڈی مارے تو وہ چھوٹے صوبوں کو کہاں خاطر میں لاتا ہو گا۔ میں نے اپنے تجربے سے آگہی پائی کہ جب چھوٹے صوبوں سے مرکز کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو اس کا ضرور کچھ مطلب ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ۱۹۷۳ء کا وہ آئین جو بچے کھچے پاکستان کی بقا اور سالمیت کے ساتھ ساتھ صوبائی خود مختاری کے اصول کو تسلیم کرنے کی بنا پر وفاقیت کی واحد ضمانت تھا اگر اسے مؤثر طور پر چلانا ہے تو اس کے لئے پنجاب سے آواز اٹھانی ہو گی۔

ایک سیاسی جماعت کی حدود و قیود اور اس جماعت کی بنائی ہوئی حکومت میں شمولیت کے باعث ایسا کرنا ممکن نظر نہ آیا تو میں اس جماعت اور اس کی حکومت کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہو گیا۔ چنانچہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۵ء کو ایک مفصل پریس کانفرنس منعقد کر کے میں نے وفاق، صوبائی خود مختاری اور چھوٹے صوبوں کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ لیکن اُس وقت مسٹر بھٹو کو مرکز میں بیٹھے ہوئے اپنی کرسی بہت مضبوط نظر آئی۔ لہٰذا انہوں نے سرحد اور بلوچستان کے لیڈروں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی قید کر دیا اور اپنے تئیں سمجھ لیا کہ اب "گلیاں سُنجیاں" ہو گئی ہیں اور ان میں "مرزا یار" من مانی کرتا پھرے گا۔ انہوں نے یہ نہ جانا کہ تین صوبوں کی قیادتوں سے مکالمہ توڑ کر وہ پاکستان میں روز بروز تنہا ہوتے چلے جائیں گے، ان کا قاعدہ (BASE) سُکڑ جائے گا، ان کے سر کا بوجھ بڑھ جائے گا اور وہ ایک ایسا لٹو بن کر رہ جائیں گے جو اپنی نوک پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے بھاری سر کو اسی وقت تک قائم رکھ سکتا ہے جب تک تیزی سے گھومتا رہے، جس لمحے بھی اس کی رفتار میں ذرا سی کمی آتی ہے یا وہ سُست پڑتا ہے تو اس کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات آئے تو مسٹر بھٹو کو اپنے جبر کی مشین کی رفتار کچھ دھیمی کرنی پڑ

گئی۔ بس ' یہ ذرا سی مہلت ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی ، وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور گر پڑے۔ اس کے ساتھ ہی مارشل لاء آگیا اور ابھی تک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔

وفاقیت کا شعور ون یونٹ کی ناکامی اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے عظیم المیے سے ابھرا تھا۔ مگر جب یہ وفاقیت بھٹو صاحب کی حکومت میں بھی بروئے کار نہ آسکی جو خود ایک چھوٹے صوبے سے تعلق رکھتے تھے تو اُسے مارشل لاء کے دوران روبہ عمل دیکھنے کی خواہش سرے سے لاحاصل تھی۔ مارشل لاء تو جب بھی آئے گا اقتدار فوج کے ہاتھ میں ہو گا لہٰذا جن صوبوں کو فوج میں نمائندگی حاصل نہیں وہ اقتدار میں شرکت کے احساس سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لئے جب تک پنجاب کے اکثریتی صوبے میں وفاق کے بارے میں پائے جانے والے مغالطوں کی صحیح صحیح نشان دہی نہیں ہوتی اور ان کا تدارک نہیں کیا جاتا ' وفاقیت کی باتیں خواہ کتنی ہی عام ہو جائیں وہ عمل میں نہ ڈھل پائیں گی۔

شروع میں فوج نے نوّے دن کے اندر اندر انتخابات کرانے کا دعویٰ اور وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسی وقت قوم کو خبردار کیا تھا کہ وہ اس دعوے اور وعدے کو حتمی نہ سمجھے کیونکہ فوج نوّے دن کا کہہ کر آتو جاتی ہے لیکن جاتے جاتے نوّے مہینے لگا دیتی ہے۔ بہر حال فوج کا دعویٰ اور وعدہ پورا نہ ہُوا۔ پھر ۱۹۷۹ء میں اس دعوے اور وعدے کی تجدید ہوئی اور حسبِ سابق نہایت آسانی سے تردید بھی۔

جس ملک کو ایک سیاسی قیادت اور سیاسی جماعت نے جمہوریت کی بنیاد پر قائم کیا تھا اسے سیاسی قیادت اور سیاسی جماعتوں سے محروم کر کے اس کی بنیاد پر ایک کاری ضرب لگا دی گئی۔ افسوس ' ہماری بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے بالواسطہ اس صورتِ حال کو نہ صرف پیدا کرنے میں مدد دی بلکہ اس پر اندر ہی اندر خوش بھی ہوئیں۔ جب متعدد سیاسی جماعتوں نے مارشل لاء کی بی ٹیم کا کردار اپنا لیا اور ساتھ ہی افغانستان میں روسی فوج داخل ہو گئی تو میں نے اندازہ کر لیا کہ اب ملک میں اچھے خاصے عرصے تک سیاسی عمل کے اجراء کی گنجائش نہیں چنانچہ میں نے تقریباً چار سال کا عرصہ خود ساختہ جلاوطنی میں کاٹا اور ملک کے اندر "کُتّے خصی" کرنے کے بجائے کچھ دیر فاصلے پر بیٹھ کر ملک کے حال و مستقبل کے بارے میں تحمل اور سکون کے ساتھ سوچا۔

اس جلاوطنی کے دور ہی میں مجھے سندھ میں ہونے والے واقعات کا علم ہُوا۔ میں نے ون یونٹ کو اپنے سامنے بنتے اور بگڑتے دیکھا تھا۔ مشرقی پاکستان میری آنکھوں کے سامنے بنگلہ دیش بنا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ فوجی حکومت اور نوکر شاہی نے جو رویہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں اپنایا تھا قریب وہی

رویہ سندھ اور بلوچستان کے بارے میں بھی اپنا لیا تھا۔ دوسری طرف اہل پنجاب نے جس طرح مشرقی پاکستان کی محرومیوں کے سلسلے میں خاموشی اختیار کئے رکھی تھی اور مسٹر بھٹو کی افسوس ناک موت پر مُہر بہ لب رہے تھے اسی طرح اب وہ سندھ سے اُٹھنے والی صدائے احتجاج اور بلوچستان سے ابھرنے والی صدائے محرومی پر چُپ بیٹھے تھے۔ ستم بالائے ستم 'ملتِ اسلامیہ اور قومی اتحاد کے نام پر وفاقیت اور اس کے بنیادی عنصر' صوبائی خودمختاری کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی تھیں۔ رجعت پسند صحافی اور دانشور پنجابیوں کو یہاں تک ورغلا رہے تھے کہ وہ اسلام کے نام پر مارشل لاء کو' کسی نہ کسی شکل میں' ہمیشہ کے لئے قبول کر لیں۔ اوپر سے فوجی اور سول نوکر شاہی اہلِ پنجاب کے کندھوں پر چڑھ کر ان کی طرف سے سندھ اور بلوچستان کے ساتھ اُسی زبان میں بات کر رہی تھی جس زبان میں اس نے اُنہی کے کندھوں پر چڑھ کر ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان کے ساتھ بات کی تھی۔ اس صورتِ حال نے میرے تحمل اور سکون کی صف لپیٹ دی اور میرا اضطراب اور جذبۂ عمل مجھے واپس وطن لے آیا۔

چار سال کی جلاوطنی کے دوران تمام تر غور و فکر کا حاصل یہ تھا کہ پاکستان ہی نہیں' پنجاب بھی صرف اور صرف وفاقیت کے اصول کو دل و جان سے قبول کر کے زندہ رہ سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہُوا تھا تو بے شک پنجاب والوں کا دِل ٹُوٹا تھا اور ان میں میرے جیسے ہزاروں کمزور دِل دھاڑیں اور ڈاڑھیں مار مار کر روئے تھے اور دیر تک رویا کئے تھے پھر بھی' جیسا کہ پنجابی میں کہتے ہیں' ہمارا "پاسہ" نہ ٹوٹا تھا' پنجاب کا جسم صحیح سلامت رہا تھا۔ لیکن اب' وطن سے دور بیٹھا میں یہ حقیقت اسی طرح برملا دیکھ سکتا تھا جس طرح آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہیں کہ اگر ہم نے وفاقیت کے تقاضوں کو نہ سمجھا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا کچھ باقی نہ بچے گا بلکہ پنجاب کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ پنجاب کی پہلے بھی بہت مرتبہ اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ کیا ہم پر تاریخ کی طرف سے یہ فرض عائد ہو چکا ہے کہ بربادی کے اس سلسلے میں ضرور کسی نئی کڑی کا اضافہ کریں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کیوں نہ بربادی کے عمل کو یہیں روک دیا جائے' کیوں نہ بربادی کا منہ پھیر دیا جائے۔ اسی طرح جن غلط روایتوں اور رویوں نے ہمیں پہلے بربادی سے دوچار کیا تھا کیوں نہ انہیں ترک کر کے بربادی کی جگہ سلامتی کی راہ اختیار کر لی جائے تاکہ نہ صرف پاکستان کی بقا اور یکجہتی بلکہ پنجاب کی سربلندی اور نیک نامی کی ضمانت بھی حاصل ہو جائے۔

روایتوں اور رویوں پر بحث کے آغاز ہی میں یہ وضاحت بے حد ضروری محسوس ہوتی ہے کہ

انسانی تاریخ کا سفر صرف ماضی کی جانب نہیں مستقبل کی طرف بھی ہے۔ قوموں اور قومیتوں کی زندگی ایک بہتے دریا کی طرح ہے جو اپنے مخرج سے مدخل کی جانب مسلسل بہتا رہتا ہے اور اپنی قدامت کے باوجود ہر لحظہ اپنے آپ کو بدلتا چلا جاتا ہے۔ پنجاب اور اہلِ پنجاب کی جو بھی روایتیں اور رویے اس کتاب میں پہلے گنوائے گئے ہیں یا اب بیان ہوں گے ان کے بارے میں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اٹل اور اٹوٹ نہیں چنانچہ اگر وہ غلط ہیں تو خواہ ان کی پیدائش کی کوئی بھی وجہ ہو انہیں ترک کرنا ہی مناسب ہو گا۔ یہ بات ثابت ہو جانے سے کہ ایک شخص پر ظلم ہُوا تھا اسے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ اب خود وہ بھی ظلم کرے اور نہ ہی دوسروں پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں ظلم سہتے رہیں۔ اگر ہم خود احتسابی کو اس کی منطقی حدوں تک لے جانا چاہتے ہیں تو پھر اس راہ میں صبر اور ثبات سے قدم مارنے ہوں گے۔ آیئے ' ذرا ایک بنیادی نکتے سے آغازِ سفر کرتے ہیں۔

بچے کی زندگی پر اس کی ماں اور اس کے باپ دونوں کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر بہت پیچ در پیچ ہوتا ہے لیکن آسانی کی خاطر کہا جا سکتا ہے کہ بالعموم ماں سے بچے کو جذباتی صلاحیتیں عطا ہوتی ہیں اور باپ سے ذہنی۔ جذبات اور ذہن کی دو ٹانگوں پر کھڑے ہو کر ہی انسانی شخصیت کا توازن قائم ہوتا اور قائم رہتا ہے ورنہ انسان لڑکھڑانے یا لنگڑانے لگتا ہے۔ یہی کچھ پنجاب کے ساتھ ہُوا۔ اہلِ پنجاب کے لئے پنجاب کو ماں کا مقام حاصل تھا اور پاکستان کو باپ کا۔ انہوں نے پنجاب کے حوالے سے اپنی پہچان ترک کر کے صرف اور صرف پاکستان کے ساتھ اپنی وابستگی کی روایت ڈالی۔ اس سے ان کی ذہنی نشوونما تو ہوئی لیکن جذباتی نشوونما بیچ ہی میں رہ گئی اور وہ کئی ایسے رویوں کا شکار ہو گئے جن کے باعث نہ صرف خود انہیں بلکہ پاکستان کو بھی بہت نقصان پہنچا۔

مجھے دہرانے دیجئے کہ اپنی پہچان نہ کر کے اور اپنے تشخص کو پاکستان کے تشخص میں گم کر کے پنجاب نے نادانستہ ' اپنے علاوہ پاکستان کے ساتھ بھی زیادتی کا ارتکاب کیا۔ اہلِ پنجاب نے پاکستان کے ساتھ اپنی وابستگی کو فنا کی حد تک پہنچا کر اپنے باپ کا تو فخریہ اقرار کیا مگر پنجاب سے انکار کر کے وہ اپنی ماں کے وجود سے یکسر منکر ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی شخصیت میں کجی آ گئی اور وہ لڑکھڑانے اور لنگڑانے لگے۔ جس ملک میں ان کا مقام ساجھے دار ' رفیق کار یا پارٹنر کا تھا انہوں نے اس میں پاکستان کے ساتھ مکمل متصوریت (IDENTIFICATION) کے باعث باپ کا کردار سنبھال لیا۔ پھر جس طرح ایک باپ اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتا ہے پنجاب نے بھی دوسرے صوبوں کی جانب ایک مشفقانہ اور محافظانہ رویہ اختیار کر لیا مگر ساتھ ہی اس نے وہ

خواہش بھی اپنائی جو اس رویے کے حامل ہر باپ کی ہوتی ہے کہ اس کے زیر نگیں اولاد اس کا کہا مانے۔

لیکن دوسرے صوبوں نے تو پنجاب کو باپ کے مقام پر نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے تو پاکستان کو ایک ایسے ملک کے طور پر اپنایا تھا جس کی دولت اور اقتدار میں ہر صوبہ برابر کا حصہ دار تھا اور جس کے تمام فیصلے چاروں صوبوں کو مل کر کرنے تھے۔ پھر ان صوبوں کے باشندوں نے پاکستان کو اپنا باپ ضرور تسلیم کیا تھا مگر ساتھ ہی اپنے اپنے صوبے کو ماں کے جائز مقام پر بھی رکھا تھا اور اپنی اپنی علاقائی زبان، ثقافت، رہن سہن اور رسم و رواج کو بھی پوری پوری اہمیت دی تھی۔ اس لئے پنجاب کا مشفقانہ اور محافظانہ رویہ انہیں ایک آنکھ نہ بھایا بلکہ اس رویے سے انہیں تسلط اور استحصال کی بُو آنے لگی۔

پنجاب اور دوسرے صوبوں کے درمیان مغالطے اور تضادات ایک مرتبہ پیدا ہو گئے تو پھر کم نہ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی تاریخ میں دستور کا بحران مسلسل و متواتر موجود رہا۔ دستور کی مضبوط رسی کے بغیر پاکستان کے صوبے باہمی کشمکش کی راہ پر چل نکلے۔ ساتھ ہی صوبائی اور مرکزی اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور فاصلے کم ہونے کے بجائے بڑھنے لگے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک پاکستان کسی متفقہ جمہوری دستور کے بغیر آزادی سے پہلے کے انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت چلتا رہا۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کی منتخبہ دستور ساز اسمبلی نے پہلا دستور منظور کیا جسے ۱۹۵۸ء میں اسکندر مرزا اور ایوب خان کے پہلے مارشل لاء نے کالعدم قرار دے دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک ایک مرتبہ پھر کسی متفقہ دستور کے بغیر گزارا ہوتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے مسٹر منظور قادر سے پاکستان کا دوسرا دستور بنوایا اور بنیادی جمہوریتوں کے منتخب اراکین سے اس کی توثیق کرا کے اسے ۱۹۶۹ء تک چلایا۔ ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان نے دوسرا مارشل لاء لگا دیا اور یوں دوسرا دستور بھی تہ تیغ ہو گیا۔ تین سال پھر کسی دستور کے بغیر گزر گئے۔ تیسرا دستور ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے عہدِ حکومت میں بنا اور اس حقیقت کے باوجود کہ اس پر سنجیدگی اور دیانت داری سے عمل نہ ہُوا یہ متفقہ جمہوری دستور ۱۹۷۷ء تک موجود رہا۔ پھر جولائی ۱۹۷۷ء میں تیسرا مارشل لاء آیا اور اس تیسرے دستور کی چھٹی ہو گئی۔ اب ۱۹۷۷ء سے پاکستان پھر مارشل لاء کے تحت چل رہا ہے۔ آسانی کی خاطر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی ابتدائی چھتیس سالہ تاریخ میں یہاں صرف بارہ سال تک کسی نہ کسی طرح کا دستور رائج رہا جبکہ بقیہ چوبیس سال اس ملک کے عوام نے

دستوری خلاء میں یا مارشل لاء کے تحت کاٹے۔ ۱۹۸۵ء میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی بحالی محض ایک فراڈ ہے جسے حکمرانوں کے سوا کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ دستور کے بغیر ادارے نہیں بنتے اور اداروں کے بغیر صوبوں کے اپنے درمیان اور صوبوں اور مرکز کے مابین دولت اور اقتدار کی صحیح اور منصفانہ تقسیم ممکن نہیں ہوتی۔ اوپر سے پاکستان کی سیاسی حکمرانی کے منصب پر بیٹھے ہوئے جاگیردار طبقے نے اپنے طبقاتی مفادات کے لئے یہی بہتر سمجھا کہ دولت اور اقتدار کی منصفانہ تقسیم کا مرحلہ کبھی نہ آئے۔اس طبقے نے دستوری خلاء کے دوران سامراجی قوتوں سے گٹھ جوڑ کر کے پاکستان کو طرح طرح کے دفاعی اور اقتصادی معاہدوں میں باندھ دیا۔ اصول کی بات ہے کہ جو ملک جس قدر سامراج کے نیچے لگ جاتا ہے اس کا دستوری ڈھانچہ اسی قدر کمزور ہو جاتا ہے۔جاگیرداری کے خاتمے اور سامراج سے گلو خلاصی کے بغیر کسی متفقہ قومی اور جمہوری دستور پر عمل در آمد کا خواب دیکھنا محض سادہ لوحی ہے۔ مگر جاگیرداری کا خاتمہ اور سامراج سے گلو خلاصی تو دراصل انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ اس انقلاب کی توقع اس ملک کے عوام نے پیپلز پارٹی کی حکومت سے کی تھی مگر پیپلز پارٹی پر مسلط جاگیردار قیادت نے اس توقع کو بری طرح پامال کیا اور انقلاب کو برسوں پیچھے ڈال دیا۔اب پاکستان مساوات پارٹی یہی انقلاب لانے کے لئے معرض وجود میں آئی اور مصروف عمل ہے۔

بہرحال اگر یہ تمام عرصہ کسی متفقہ دستور کے تحت سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی ادارے بنا کر گزارا جاتا تو یقیناً نہ صرف مرکز کے حوالے سے صوبوں کو اپنے اصل مقام اور اختیارات سے آگاہی حاصل ہو جاتی بلکہ پنجاب اور دوسرے صوبوں کے درمیان بھی خواہ مخواہ مغالطے اور تضادات پیدا نہ ہوتے۔

مغالطوں اور تضادات کے سلسلے میں پاکستان کی سیاسی تاریخ میں دو واقعے انتہائی اہم ہیں۔ پہلا واقعہ ون یونٹ کے بننے اور ٹوٹنے سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا واقعہ مشرقی پاکستان کے ہم سے جدا ہونے اور بنگلہ دیش بن جانے سے۔ اگر ہم ان دو واقعات کے منظر و پس منظر پر گہری نظر ڈال کر ان کی پوری پوری معنویت اور اہمیت کو پا جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مغالطے اور تضادات نہ صرف بخوبی واضح بلکہ دور بھی ہو سکتے ہیں جن کے باعث پاکستان میں آج تک وفاقیت پنپ نہیں سکی۔ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم وفاقیت کے تقاضوں کو سمجھ کر پاکستان کے عوام، خصوصاً اہل پنجاب کے دل و دماغ میں پائے جانے والے مغالطوں اور ان کی سیاسی اور معاشی زندگی میں کارفرما تضادات کی صحیح صحیح وضاحت کر سکیں اور ساتھ ہی انہیں رفع کرنے کا عزم کر لیں تو وہ صورتحال بدل سکتی ہے جس

کے باعث پاکستان کی یکجہتی اور سلامتی مسلسل خطرے میں پڑی رہتی ہے اور صوبوں کے اپنے درمیان اور صوبوں اور مرکز کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ون یونٹ کا قیام وانجام اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی ـــــ ماضی کے ان دو تاریک واقعات کا بے لاگ تجزیہ ہمارے مستقبل کو اُجالنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

چھٹا باب

وَن یونٹ اور مشرقی پاکستان

جب مشرقی پاکستان نے اپنی چوّن فیصد آبادی کی بنیاد پر پاکستان کی سیاست اور معیشت میں اپنے حقوق کے لئے زیادہ جوش و خروش سے آواز اٹھانی شروع کی تو ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ون یونٹ کے نام سے ایک انتظامی وحدت میں ڈھال دیا گیا جس کا دارالحکومت لاہور قرار پایا۔

یاد رہے کہ ون یونٹ کے قیام کے وقت پاکستان کا دارالحکومت کراچی تھا لیکن جب ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کیا تو اس نے ایک پرانی تجویز کے تحت پنجاب میں راولپنڈی کے قریب اسلام آباد کے نام سے ایک نیا شہر آباد کر کے دارالحکومت وہاں منتقل کر دیا۔ دوسرے صوبوں کی طرف سے پاکستان پر تسلط جما لینے کا الزام پنجاب پر اس وجہ سے بھی عائد ہوتا رہا ہے کہ پاکستان اور ون یونٹ دونوں کے دارالحکومت پنجاب کی حدود میں واقع تھے اور لوگوں کو دور دراز سے اپنے کاموں کے لئے پنجاب آنا پڑتا تھا۔ یوں بھی اُس وقت ملک میں وحدانی اور صدارتی نظامِ حکومت اپنا لیا گیا تھا جس میں اختیارات مرکز، صدر اور گورنروں کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتے ہیں۔

وحدانی اور صدارتی نظام کے باعث ون یونٹ میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ سندھ، سرحد اور بلوچستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ اقتدار کے مرکزوں سے دور ہو گئے ہیں اور اقتدار کے دونوں مرکز، اسلام آباد اور لاہور، پنجاب میں واقع ہیں۔

ایوب خان کے دورِ حکومت میں نواب کالاباغ ایک طویل عرصے تک مغربی پاکستان یا ون یونٹ

کے گورنر رہے۔ انہوں نے وحدانی اور صدارتی نظام میں تھانے داری کے رویے کو بھی شامل کر دیا۔ آج تو صوبے الگ الگ موجود ہیں اور کچھ نہ کچھ اختیارات ڈویژن اور ضلع کی سطح تک منتقل ہو چکے ہیں جس کی ایک مثال یہ ہے کہ تقریباً ہر ڈویژن میں ہائی کورٹ کا بنچ موجود ہے لیکن ایوب خان اور نواب کالاباغ کے دور میں ایسا نہ تھا۔ اُس دور میں آج کے پاکستان اور اُس وقت کے مغربی پاکستان میں پتا بھی نواب کالاباغ کی اجازت کے بغیر نہ ہلتا تھا۔

اس حقیقت کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ ون یونٹ کے قیام کے دوران مغربی پاکستان میں اپنی ۶۳ فیصد آبادی کے باوجود پنجاب نے پندرہ سال کے لئے صرف چالیس فیصد حقوق پر رضا مندی ظاہر کی تھی اور اس پر عمل در آمد بھی ہوتا رہا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے باوجود چھوٹے صوبوں نے ون یونٹ میں ایک شدید گھٹن محسوس کی تھی۔ جب مغربی پاکستان کے دور دراز کے علاقوں سے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بار بار لاہور آنا پڑا تو انہیں بجا طور پر احساس ہُوا جیسے وہ مغلیہ یا انگریزی عہدِ حکومت میں جی رہے ہیں۔ ان پر شدت سے واضح ہُوا کہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے انہیں صوبائی خود مختاری حاصل نہیں ہے۔

اس صورتِ حال سے چھوٹے صوبوں کے عوام میں نہ صرف ون یونٹ کے سلسلے میں عمومی طور پر احساسِ نامرادی پیدا ہُوا بلکہ پنجاب کے سلسلے میں خصوصی طور پر بد دلی پھیلی۔ یہ بجا ہے کہ ون یونٹ کے دوران خود پنجاب کے بہت سے علاقوں میں غیر پنجابی افسر متعین رہے لیکن لاہور سے قربت کی وجہ سے پنجاب کے لئے انہیں برداشت کرنا نسبتاً آسان تھا۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ان صوبوں سے باہر کے جو افسر متعین ہوئے ان میں پنجابیوں کی بہ نسبت اردو بولنے والے افسروں کی بہتات تھی۔ لیکن ان افسروں کے خلاف سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کی شکایت ذاتی یا گروہی سطح سے تجاوز نہ کر سکی۔ اس کے بر عکس جب پنجابی افسر اور تھانے داران صوبوں کے دور دراز علاقوں میں اپنے "فرائض" ادا کرنے کے لئے پہنچے اور انہوں نے نوکر شاہی کے روایتی رویوں کا مظاہرہ کیا تو سندھ، سرحد اور بلوچستان کے عوام نے ان افسروں کو کوسنے کے بجائے پنجاب کو کوسنا شروع کر دیا اور جہاں ون یونٹ کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار قرار دیا وہاں پنجاب کو اپنے حقوق کا غاصب سمجھنے لگے۔ آخر جولائی ۱۹۷۰ء میں یحیٰ خاں نے ون یونٹ توڑ دیا اور صوبے بحال ہو گئے۔

نہ ون یونٹ بناتے وقت اس میں شامل صوبوں کے عوام سے پوچھا گیا، نہ ون یونٹ توڑتے

وقت انہیں اعتماد میں لیا گیا۔ ون یونٹ مغربی پاکستان کے جوڑ توڑ کے ماہر سیاست دانوں نے مشرقی پاکستان کو قابو میں رکھنے کے لئے بنایا تھا جس کی آبادی روز بروز بڑھتی جارہی تھی اور آبادی کے لحاظ سے اکثریت کی بنا پر اقتدار اور قومی خزانے میں سے زیادہ حصہ مانگنے لگی تھی۔ مغربی پاکستان کے چار صوبوں کو ون یونٹ میں ڈھال کر اسمبلی میں دونوں بازوؤں کو برابر برابر نمائندگی دے دی گئی تھی تاکہ مشرقی پاکستان اپنی اکثریت کی بنا پر ملک کے اقتدار اور دولت میں حصہ نہ پاسکے۔ بالکل اسی طرح ون یونٹ توڑا بھی مشرقی پاکستان کو قابو رکھنے کے خیال سے گیا تھا جہاں اب پیرٹی کے بجائے "ایک آدمی ایک ووٹ" کا نعرہ اور شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات زور پکڑ رہے تھے۔ اس وقت اندازہ تھا کہ یحییٰ خان کے مارشل لاء کے خاتمے کے بعد جس طرح کا دستور پاکستان میں نافذ ہوگا وہ صدارتی اور وحدانی کے بجائے پارلیمانی اور ساتھ ہی وفاقی ہوگا۔ یہ بھی اندازہ کرلیا گیا تھا کہ وفاق کو چلانے کے لئے سینیٹ بھی ضرور تشکیل دیا جائے گا۔ جس طرح "ایک آدمی ایک ووٹ" کا اصول تسلیم کرلینے کی صورت میں مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو جاتی تھی جیسا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ہوا اسی طرح اگر ون یونٹ کو توڑا نہ جاتا اور اسی حالت میں سینیٹ تشکیل پاتا تو اس میں بھی مشرقی پاکستان کو برابر کی نشستیں حاصل ہو جاتیں۔ یوں مجموعی طور پر پارلیمینٹ کے اندر اور باہر مشرقی پاکستان کا سیاسی غلبہ ہو جاتا۔ ون یونٹ کو واپس چار صوبوں میں بانٹ کر اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ جہاں "ایک آدمی ایک ووٹ" کے اصول پر مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو وہاں کم از کم سینیٹ میں مغربی پاکستان کو واضح اکثریت مل جائے۔ یاد رہے کہ سینیٹ میں صوبوں کو آبادی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ وفاقی اکائیوں کے طور پر برابر برابر نشستیں ملتی ہیں۔ اگر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان ہم سے جدا نہ ہوتا اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق سینیٹ تشکیل پاجاتا تو اس میں مشرقی پاکستان کو صرف چودہ سیٹیں ملتیں جبکہ مغربی بازو کے چار صوبوں کو مجموعی طور پر ۵۶ = ۴ × ۱۴ سیٹیں حاصل ہو جاتیں۔ بے شک مشرقی پاکستان کے ہمارے ساتھ رہنے کی صورت میں جو دستور بنتا وہ ۱۹۷۳ء کے دستور سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتا لیکن اسے یہاں محض ایک نکتے کی وضاحت کے لئے پیش نظر رکھا جارہا ہے۔ اس دستور کے مطابق ملک کے صدر کا انتخاب پارلیمینٹ کرتی ہے جس میں قومی اسمبلی اور سینیٹ دونوں ایوانوں کے اراکین شامل ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کو اکثریت حاصل ہو گئی تھی، وزیر اعظم لازماً اسی بازو سے منتخب ہوتا تھا خصوصاً جب کہ اس بازو کی ایک کے سوا تمام نشستیں عوامی

لیگ نے جیت لی تھیں۔ ون یونٹ کو توڑ کر سینیٹ کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ میں مغربی بازو کی اکثریت پیدا کی گئی تھی تاکہ کم از کم صدر تو لازماً اس بازو سے منتخب ہو جایا کرے۔ ملک ٹوٹ نہ جاتا تو پارلیمنٹ میں دونوں بازوؤں کی پوزیشن یہ ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے ۱۰۸ اراکین قومی اسمبلی میں ۱۴ اراکینِ سینیٹ جمع ہو کر ان کی کل تعداد ۱۲۲ بن جاتی جبکہ مغربی بازو کے چار صوبوں کے ۹۲ اراکینِ قومی اسمبلی میں ان کے ۵۶ اراکینِ سینیٹ شامل ہو کر ان کی گنتی کو ۱۴۸ تک پہنچا دیتے بلکہ اسلام آباد کے ایک رکن قومی اسمبلی اور دو اراکینِ سینیٹ کا اضافہ کر لیا جائے تو مشرقی پاکستان کے ۱۲۲ اراکین کے مقابلے میں ان کی تعداد ۱۵۱ تک پہنچ جاتی۔

بہر حال مشرقی پاکستان ہمارے ساتھ نہ رہا۔ اُس وقت بچے کھچے حصے کے عوام نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ملک اس لئے ٹوٹا ہے کہ مشرقی پاکستان سے اٹھنے والے احتجاج پر بروقت توجہ نہ دی گئی، اس کے حقوق کو دبانے کے لئے سازشی حربے استعمال کئے گئے اور اس کے احساسِ محرومی کو تشدد سے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ اس آگہی اور انکشاف نے سندھ، سرحد اور بلوچستان کے ساتھ ساتھ پنجاب کو ہمیشہ کے لئے نہ سہی تو کم از کم وقتی طور پر قائل کر دیا کہ مضبوط مرکز کے مروّجہ تصور میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہ راز اس کے منتخب نمائندوں پر کھُل گیا کہ طاقت کو مرکز میں مرکوز کر کے نہیں بلکہ چاروں صوبوں کے عوام کو جمہوری اداروں کے ذریعے اقتدار میں احساسِ شرکت دلا کر ہی ملک کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ اسی آگہی اور انکشاف کے نتیجے میں ۱۹۷۳ء کا دستور وجود میں آیا تھا۔

اور آج جب ۷۱۔۱۹۷۰ء کے پُر آشوب دور اور دردناک واقعات کو بیتے اتنے بہت سے سال ہو چکے ہیں تو تاریخ کو اور بھی زیادہ غیر جذباتی انداز سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ آج کچھ صداقتیں پہلے سے بھی زیادہ واشگاف ہو چکی ہیں مثلاً آج سندھ، سرحد اور بلوچستان ہی نہیں، پنجاب کے وسیع تر حلقوں میں یہ احساس عام ہے کہ زبان کے مسئلے پر شروع ہی سے ایک حقیقت پسندانہ رویہ اپنا لیا جاتا تو مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان اور پنجاب کے بارے میں منافرت نہ پھیلتی۔ اور اسی طرح اگر خاکی اور مفتی پہننے والی ہر دو نوکر شاہیوں میں مشرقی پاکستان کو اس کی آبادی کے اعتبار سے بروقت نمائندگی دے دی جاتی اور اس پر اسلام آباد سے حکومت کرنے کے بجائے خود اس کے اپنے لوگوں اور اہل کاروں کے ذریعے ڈھاکہ سے حکومت ہوتی تو حالات یکسر مختلف ہوتے۔

آج یہ حقیقت بھی سامنے آچکی ہے کہ گو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک جگتو فرنٹ کے منشور سے شروع ہوتی ہے مگر یہ دراصل ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد تیز تر اور شدید تر ہوئی تھی۔ اس جنگ سے پہلے یہ فلسفہ پیش کیا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان پر منحصر ہے لیکن جب ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مغربی بازو بمشکل اپنا ہی دفاع کر سکا اور اس نے مشرقی بازو کیلئے ایک مکھی تک نہ ماری اور مشرقی پاکستان صرف اور صرف چین کی اُس دھمکی کے باعث محفوظ رہا جو چین نے بھارت کو دی تھی تو وہاں کے عوام اور قائدین نے محسوس کر لیا کہ دفاع کے نام پر قومی دولت کا جو ساٹھ ستّر فیصد حصہ فوج کیلئے الگ رکھ لیا جاتا ہے اس سے مشرقی پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

میں یہاں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کس نے شروع کرائی اور کیوں شروع کرائی البتہ اس حقیقت کا اعتراف ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ اس جنگ میں پہل پاکستان نے کی تھی۔ چنانچہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء سے تقریباً ایک مہینہ پہلے مقبوضہ کشمیر میں ہندوستان کے بقول پاکستانی "گھس بیٹھیے" بھیجے گئے تھے۔ تاریخ جب بھی اصل حقائق سے پردہ اٹھائے گی یہ ثابت ہو جائے گا کہ ۱۹۶۵ء کی وہ جنگ جس پر مغربی پاکستان، خصوصاً پنجاب میں بہت شادیانے بجائے گئے ہیں پاکستان کی قومی تاریخ کا ایک سنگین واقعہ تھا۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہماری شکست ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہی کا ایک شاخسانہ تھا۔

بہر حال ۱۹۷۱ء کی شکست کے بعد ان بڑی بڑی حقیقتوں سے بھی بڑی ایک حقیقت کا احساس ابھرا کہ اگر مشرقی پاکستان سے اٹھنے والی صدائے محرومی اور وہاں سے بلند ہونے والے احتجاج پر بروقت توجہ دی جاتی اور اقتدار میں اس کے عوام کی شرکت کا مناسب بندوبست کر دیا جاتا تو بات پہلے سنبھل جاتی۔ مگر جب اس ہمدردانہ رویئے کے برعکس ایک مخاصمانہ رویہ اپنایا گیا تو سب نے دیکھ لیا کہ وہ صدائے محرومی جسے غداری قرار دیا گیا اور وہ احتجاج جسے تشدد سے دبایا گیا بالآخر ایک بغاوت میں ڈھل گئے۔

یہ فروری ۱۹۶۶ء کی بات ہے، اعلان تاشقند کو ابھی بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ لاہور کی مال پنجابی طالب علموں کے خون سے سرخ ہو گئی جنہیں یقین تھا کہ ایوب خان نے تاشقند میں قومی غیرت کا سودا کر لیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگی کامیابیوں کا جو ڈھنڈورا ایوب حکومت نے پراپیگنڈا مشینری کے ذریعے پیٹا تھا جب اس کی حقیقت اعلانِ تاشقند کی شکل میں لوگوں پر واضح ہوئی تو انہوں نے جذبات میں آ کر اصل حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ ایوب خان

نے جنگ کے میدان میں جیتی ہوئی بازی تاشقند میں گفتگو کی میز پر ہار دی ہے!اس عرصے میں ذوالفقار علی بھٹو کو ایوب خان نے وزارت سے فارغ کر دیا تھا۔ بھٹو صاحب نے دورانِ وزارت معاہدۂ تاشقند کا بھری اسمبلی میں دفاع کیا تھا لیکن اب اپنے سیاسی مقاصد کو آگے بڑھانے کیلئے وہ منہ سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی اشاروں کنایوں اور حرکات و سکنات سے پاکستان کے عوام خصوصاً اہل پنجاب کو باور کرا رہے تھے کہ تاشقند کا معاہدہ ملکی مفادات کے خلاف تھا۔ایسے میں یہ اقدام حکومت کی شدید ضرورت بن گیا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی توجہ اعلانِ تاشقند سے ہٹا دے۔

انہی دنوں گلبرگ لاہور میں واقع چودھری محمد علی مرحوم کی کوٹھی پر اپوزیشن جماعتوں کا ایک اجتماع منعقد ہُوا جس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے پہلے پہل مشرقی پاکستان کی طرف سے چھ نکات پر مبنی ایک چارٹر آف ڈیمانڈز پیش کیا۔ اور کیا چاہیے تھا 'اللہ دے اور بندہ لے' حکومتِ وقت نے چھ نکات کو غداری کا خوفناک منصوبہ قرار دے کر اپنی تمام تر پراپیگنڈا مشینری کا رخ اس کے خلاف تشہیر کی جانب پھیر دیا۔ گو اُس وقت کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین نے مجیب الرحمٰن کو مناظرے کی دعوت بھی دی لیکن یہ مناظرہ کبھی نہ ہو سکا اور یوں صرف یک طرفہ اشتہار بازی جاری رہی۔

جب اپوزیشن جماعتوں نے دیکھا کہ حکومت وقت چھ نکات سے اپنے استحکام کیلئے فائدہ اٹھا رہی ہے تو انھوں نے بھی اس پروگرام کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہاں تک کہا گیا کہ اس کے اصل خالق مجیب الرحمٰن نہیں بلکہ اُس وقت کے سیکرٹری اطلاعات مسٹر الطاف گوہر ہیں۔ اور تو اور خود عوامی لیگ دو حصوں میں بٹ گئی اور نوابزادہ نصر اللہ خان مجیب الرحمٰن سے الگ ہو گئے۔

تقریباً پورا ۱۹۶۶ء 'پورا ۱۹۶۷ء 'پورا ۱۹۶۸ء 'پورا ۱۹۶۹ء اور تقریباً پورا ۱۹۷۰ء گزر گیا۔ یہ قریب قریب پانچ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ تب دسمبر ۱۹۷۰ء میں جا کر عام انتخابات ہوئے۔ فروری ۱۹۶۶ء سے دسمبر ۱۹۷۰ء کے اس تمام عرصے میں الاماشاء اللہ مغربی پاکستان کی بڑی سیاسی جماعتوں یا اسلام آباد کی فوجی حکومت نے نہ تو مجیب الرحمٰن کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات یا افہام و تفہیم کی ضرورت سمجھی اور نہ انہیں اس کی توفیق ہوئی۔ الٹا فوجی حکومت نے مجیب الرحمٰن پر اگرتلہ سازش کے نام سے مقدمہ کھڑا کر دیا اور پنجاب سے ایک وکیل کو یہ مقدمہ لڑنے اور ایک جج کو یہ مقدمہ سننے کیلئے ڈھاکہ بھیج دیا۔

مغربی پاکستان میں اس مقدمے کے بارے میں شاید ہی کوئی لفظ چھپا ہو لیکن مشرقی پاکستان میں اس کی ذرا ذرا سی تفصیل کھلے بندوں شائع ہوتی تھی۔ اُدھر مجیب الرحمٰن ایک سیاسی آدمی تھے، جب ان کیلئے کھلی سیاست کی گنجائش نہ چھوڑی گئی توانہوں نے اس مقدمے ہی کو اپنی سیاست آگے بڑھانے کا وسیلہ بنالیا۔ بحث کرنے والے وکلاء ان سے نام پوچھتے تھے تو وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے بجائے کہتے تھے، "بنگلہ بندھو" ۔ باپ کا نام پوچھا جاتا تو بتاتے تھے "بنگلہ دیش" ۔ مشرقی پاکستان کے عوام محسوس کرتے تھے کہ شیخ صاحب بے گناہ ہیں۔ وہ اس مقدمے کی تفصیلات پڑھتے اور بنگلہ بندھو کے لئے روتے تھے جسے ان کی محرومیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا۔ بے شک بھٹو صاحب نے اُس زمانے میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ مجیب الرحمٰن کی طرف سے بطور وکیلِ صفائی پیش ہونا چاہتے ہیں لیکن یہ بات آگے نہ بڑھی۔ البتہ اگرتلہ سازش کیس کسی نتیجے کے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ جُوں جُوں مجیب الرحمٰن کی رہائی دُور ہوتی گئی، مشرقی پاکستان کی علیحدگی قریب آتی گئی۔

ایوب خان کے آخری دنوں میں مجیب الرحمٰن کو گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے پیرول پر رہا کیا گیا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد مارچ ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ شیخ مجیب صاحب دو سال باہر رہے۔ جب مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع ہوئی تو انہیں گرفتار کر کے مغربی پاکستان پہنچا دیا گیا۔ لیکن دو سال کے اس وقفے میں مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کے عوام کے ذہنی اور جذباتی جغرافیے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات ہوئے تو مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کو مرحوم نور الامین کی ایک نشست کے سوا تمام کی تمام نشستیں مل گئیں۔

مجیب الرحمٰن نے چھ نکات پر انتخابات سمیٹ لئے تو پہلی مرتبہ ان سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ انتخابات کے فوراً بعد جنوری ۱۹۷۱ء میں مسٹر بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک بہت بڑی ٹیم لے کر ڈھاکہ گئے اور وہاں تقریباً ایک ہفتے کے قیام کے دوران مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ سے انفرادی اور اجتماعی مذاکرات کئے۔ دونوں جماعتوں کی دو مذاکراتی ٹیمیں چار روز تک دھان منڈی میں مجیب الرحمٰن کے گھر پر ہر صبح ملتی رہیں۔

اس دور میں میرے دو ذاتی دوست ڈاکٹر مس کنیز فاطمہ یوسف اور مسٹر الطاف گوہر وقتاً فوقتاً مجھ سے کہتے رہتے تھے اور میں پیپلز پارٹی کے اندر بھٹو مرحوم سے اصرار کرتا رہتا تھا کہ پاکستان کی سالمیت

کیلئے پیپلز پارٹی کو عوامی لیگ کے ساتھ اور مسٹر بھٹو کو شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ سیاسی مکالمہ جاری کرنا اور جاری رکھنا چاہئے۔ چونکہ میرا یہ اصرار انتخابات سے پہلے کا چلا آرہا تھا اس لئے ہو سکتا ہے بھٹو صاحب نے اسی وجہ سے مجھے پیپلز پارٹی کی مذاکراتی ٹیم کا کنوینر بنایا ہو۔ اُس ٹیم میں میرے علاوہ مسٹر جے اے رحیم، میاں محمود علی قصوری، شیخ محمد رشید اور مسٹر حفیظ پیرزادہ شامل تھے۔ میاں محمود علی قصوری دو ایک روز بعد ڈھاکہ پہنچے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی جگہ مسٹر رفیع رضا شریک کر لئے گئے تھے جہاں تک مجھے یاد ہے عوامی لیگ کی طرف سے مسٹر قمر الاسلام، مسٹر تاج الدین، مسٹر مشتاق کھونڈکر، مسٹر ظہیر الدین اور مسٹر نذر الاسلام شامل تھے۔ یہ ٹیمیں دونوں جماعتوں کے درمیان اپنے اپنے منشوروں کی روشنی میں اشتراکِ عمل کی گنجائش ڈھونڈنے نکلی تھیں۔

اُس وقت کم از کم مغربی پاکستان کے وسیع حلقوں میں محسوس کیا جا رہا تھا کہ پاکستان میں مارشل لاء کے بعد جو بھی نظامِ حکومت آئے گا اس میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں انتخابات جیتنے والی دونوں جماعتیں — پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ ایک دوسرے سے تعاون کرنے پر مجبور ہوں گی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گو عوامی لیگ نے ایک واحد سیاسی جماعت کے طور پر پورے پاکستان میں واضح اکثریت حاصل کر لی تھی لیکن اس نے یہ اکثریت اپنے چھ نکاتی پروگرام پر صرف اور صرف مشرقی پاکستان میں اور وہاں کی چون فیصد آبادی کے بل بوتے پر حاصل کی تھی۔ اس پروگرام کے بارے میں مغربی پاکستان کے عوام کو یکسر غافل رکھا گیا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک یہ تسلی نہ کر لی جاتی کہ یہ پروگرام بظاہر پاکستان کی سالمیت کے منافی نہیں اور در حقیقت اس سے مغربی پاکستان کے حکمران طبقوں، گماشتہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے مہروں کو کوئی بنیادی نقصان نہیں پہنچتا، اس جماعت کو اقتدار منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر پیپلز پارٹی صرف پنجاب اور سندھ میں اکثریت حاصل کر پائی تھی۔ اگر وہ چھ نکات پر عوامی لیگ سے کوئی سمجھوتہ کر بھی لیتی تو سرحد اور بلوچستان کی نمائندہ یا اکثریتی جماعتوں کے رویئے کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی ضمانت نہ دے سکتی تھی۔

پھر بھی دونوں مذاکراتی ٹیموں کے درمیان خاصا اتفاق رائے موجود تھا اور توقع تھی کہ اگر بات کو سنجیدگی سے آگے بڑھایا جاتا تو کم از کم عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان کوئی قابلِ قبول اور قابلِ عمل سمجھوتا ہو جاتا جس سے نہ صرف مرکز میں یہ دونوں جماعتیں شریکِ اقتدار ہو جاتیں بلکہ مرکز اور

صوبوں کے اختیارات کی ایسی تقسیم وجود میں آجاتی کہ پاکستان ایک وفاق کے طور پر چلنے لگتا اور پاکستان کی حدود میں مختلف صوبے جس محرومی اور گھٹن کا شکار تھے انہیں اس سے نجات مل جاتی۔

دونوں ٹیموں کے باہمی مذاکرات کے علاوہ مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب بھی ہر روز آپس میں ملتے رہتے تھے۔ جو کچھ میرے علم میں ہے اس کے مطابق شیخ صاحب نے مسٹر بھٹو سے کہا تھا کہ تمہاری مذاکراتی ٹیم اچھی انگریزی بول کر میری ٹیم کو تو مرعوب کر سکتی ہے لیکن میں مرعوب ہونے والا نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دراصل شیخ صاحب اس موقع پر اپنے قانونی اور آئینی استحقاق سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ عوامی لیگ قومی اسمبلی میں اپنی واضح اکثریت کی بدولت پاکستان پر اکیلے حکومت کر سکتی تھی۔ اس کے برخلاف شیخ صاحب کو پیپلز پارٹی کی مذاکراتی ٹیم اور بھٹو صاحب سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ملک پر عوامی لیگ کے بلاشرکتِ غیرے حکومت کرنے کے حق کو تسلیم کرنے کے بجائے اقتدار میں شرکت کا نسخہ بیچنا چاہتے ہیں۔ بہرحال ڈھاکہ میں قیام کے اختتام پر مسٹر بھٹو نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اعلان کیا کہ چونکہ ون یونٹ ختم ہو چکا ہے اور مغربی پاکستان دوبارہ صوبوں میں بٹ گیا ہے اس لئے مغربی پاکستان میں مجموعی طور پر اکثریت حاصل ہونے کے باوجود پیپلز پارٹی سرحد اور بلوچستان کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی چنانچہ ان حالات میں ضروری ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں سے جو گفتگو ہوئی ہے اس کی روشنی میں پیپلز پارٹی سرحد اور بلوچستان کی نمائندہ جماعتوں سے بھی مذاکرات کرے۔

جن پروازوں سے ہم لوگ واپس آئے وہ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آنے والی آخری پروازیں تھیں۔ عین اسی وقت لاہور میں گنگا جہاز کے اغوا کا واقعہ پیش آ چکا تھا اور بھارت نے اپنی زمین کے اوپر سے پاکستانی پروازیں بند کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس طرح وہ مکالمہ جو پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد بمشکل پانچ دن کے لئے جاری ہُوا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹُوٹ گیا۔

اس کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کو یحییٰ خان نے اسلام آباد آنے کی دعوت دی لیکن وہ نہ آئے۔ بالآخر مارچ ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خاں خود مشرقی پاکستان گئے لیکن اس سے قبل بھٹو صاحب ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو لاہور میں مینارِ پاکستان کے سائے تلے اعلان کر چکے تھے کہ مغربی پاکستان سے جو اراکین اسمبلی ڈھاکہ کے مجوزہ اجلاس میں شرکت کریں گے وہ یک طرفہ ٹکٹ لے کر جائیں گے۔ یحییٰ خان نے مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈروں خصوصاً بھٹو صاحب کو بھی ڈھاکہ بلوایا اور پہلی مرتبہ مجیب، بھٹو اور یحییٰ ایک ساتھ گفتگو کی میز پر بیٹھے۔ لیکن یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ اُس وقت شیخ

مجیب الرحمن نے اپنا وہی موقف دہرایا جو وہ چند روز قبل پلٹن میدان میں بیان کر چکے تھے کہ اب وہ اپنے عوام کے فیصلے کے قیدی ہیں 'مشرقی پاکستان کے عوام نے انہیں چھ نکات پر ووٹ دیا ہے اور وہ ان سے کسی صورت انحراف نہیں کر سکتے۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے ڈھاکہ میں آرمی ایکشن شروع کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے واپس کراچی پہنچ کر کہا کہ پاکستان کو بچا لیا گیا ہے۔ لیکن وہ آرمی ایکشن طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا جسے بغاوت کو کچلنے کے نام پر شروع کیا گیا تھا اور جس کا کوئی جواز ہو سکتا تھا تو صرف اس حد تک کہ کلازوٹزا اور ماؤزے ژنگ کے بقول اُس مکالمے کو جاری کر دے جو ایک جگہ آکر رُک گیا تھا۔ یہ آرمی ایکشن آہستہ آہستہ انسانی تاریخ کا ایک بہت بڑا قتل عام بن گیا جو نو مہینے بعد دنیا کی فوجی تاریخ کی ایک بہت بڑی شکستِ فاش پر منتج ہوا۔ ہمارے وہ جرنیل جنھوں نے اس دعوے اور اعلان سے اس قتلِ عام کا آغاز کیا تھا کہ ہم بنگالیوں کی نسلیں بدل کر رکھ دیں گے 'نوے ہزار جنگی قیدی اور اپنے پستول ہندوستان کے حوالے کر کے ہاتھ ملتے پائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر شیخ مجیب الرحمن یا مشرقی پاکستان کی بات ابتدا ہی میں ہمدردی اور توجہ سے سن لی جاتی تو نہ اس قتلِ عام کی نوبت آتی اور نہ اس شکستِ فاش کی۔ مگر اُس وقت یہی مناسب سمجھا گیا کہ مشرقی پاکستان سے اٹھنے والی صدائے احتجاج کو یا تو نظر انداز کیا جائے یا تشدد سے دبا دیا جائے۔ لیکن ایسے رویے کا ایک ہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ جسم کی چوٹ دل کی چوٹ بن کر اندر ہی اندر گہری ہوتی جاتی ہے اور ہر نیا احتجاج پہلے سے وسیع تر اور شدید تر صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

تشدد کرنے والی قوتیں شروع میں سمجھتی ہیں کہ ہم نے احتجاج کو دبا کر کامیابی حاصل کر لی اور احتجاج ناکام ہو گیا ہے۔ لیکن جب احتجاجوں کے سلسلے کی ہر نئی کڑی پہلے سے مضبوط ہوتی چلی جاتی اور بالآخر بغاوت بن کر کامیاب ہو جاتی ہے تو ماضی کے وہ تمام احتجاج جنھیں تشدد سے ناکام بنا دیا گیا تھا اچانک کامیاب قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ کبھی انگریزوں نے بھی پلاسی کی جنگ جیت لی تھی اور ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے بظاہر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو بھی ناکام بنا دیا تھا۔ جلیانوالہ باغ میں تو انہوں نے لوگوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت انگریز یقیناً یہی سمجھتے ہوں گے کہ یہ سب احتجاج اور تحریکیں دبا کر ناکام بنا دی گئی ہیں۔ لیکن جب انجامِ کار ۱۹۴۷ء کا یومِ آزادی طلوع ہوا تو دیکھنے والوں نے اُن تمام احتجاجوں اور تحریکوں کو تاریخ کے اوراق میں زندہ اور کامیاب محسوس کیا جنھیں بظاہر ناکامیوں کے اندھیرے موت کی نیند سُلا چکے

تھے۔ جائز حقوق کی خاطر جو احتجاج بھی بلند ہوتا اور جو تحریک بھی اٹھتی ہے بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے، خواہ شروع میں کتنی ہی ناکامیاں پیش آئیں۔ اس کے برعکس دوسروں کے جائز حقوق دبانے والے کچھ عرصے کے لئے تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بالآخر انہیں صرف اور صرف ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کا واقعہ مغربی پاکستان میں بسنے والے لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونا چاہئے تھا۔ ابتدا میں یہ احساس خاصا شدید تھا کہ ہم نے مشرقی پاکستان اس لئے گنوا دیا کہ اس کی محرومیوں پر بروقت توجہ نہ دی۔ اس ضمن میں سب سے اہم پشیمانی یہ تھی کہ ہم نے وہاں نوکر شاہی کے جو مہرے بھیجے انہوں نے بنگالیوں پر اس طرح حکومت کی کہ انگریزوں سے بھی زیادہ رعونت، بے رخی اور لاتعلقی کا اظہار کیا۔ نئے "کالے صاحب" پرانے "گورے صاحبوں" سے بھی بڑھ کر عوام دشمن ثابت ہوئے۔ اگرچہ ان میں بھی غیر پنجابی اردو دانوں کی اکثریت تھی لیکن جو گنے چنے پنجابی افسر وہاں گئے تھے وہ بھی اردو ہی بولتے تھے اس لئے یہ سب پنجابی اور غیر پنجابی افسر پنجاب ہی کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے اور یوں پنجاب کے بارے میں مشرقی پاکستان کے اندر نفرت پیدا ہونے اور بڑھنے لگی۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر ابتدا ہی میں اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا جاتا اور اس سلسلے میں ایک دیانت دارانہ کوشش کی جاتی اور مغربی پاکستان کے لوگ بھی اردو کیساتھ ساتھ بنگالی اور مشرقی پاکستان کے لوگ بنگالی کے ساتھ ساتھ اردو سیکھ لیتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ بے شک اس رائے میں وزن ہے لیکن اس سلسلے میں میرا الگ نظریہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب برِ صغیر کے مسلمانوں نے پاکستان بنایا تھا اور اس کے لئے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے تو مسلم لیگ کے منشور کی یہ شِق بھی ان کے پیشِ نظر تھی کہ پاکستان بنے گا تو اس کی قومی زبان اردو ہو گی۔ اسی منشور سے وفاداری کے تحت قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان کی سرزمین پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہو گی۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو یہ اُن تمام مسلمانوں کی قربانیوں کے ساتھ غداری کے مترادف ہوتا جنھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پاکستان میں نہ رہیں گے پاکستان کی حمایت کی تھی اور ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے جبر کا نشانہ بننا منظور کیا تھا۔ غلطی یہاں نہیں ہوئی کہ اردو

کے ساتھ ساتھ بنگالی کو کیوں قومی زبان نہیں بنایا گیا، غلطی یہاں ہوئی ہے کہ اہلِ پنجاب نے آزادی کے بعد بھی زبان کے مسئلے پر خودارانہ فیصلے نہیں کیے۔ وہ اردو جو اُن پر انگریز نے ان کی قومیت کو ملیامیٹ کرنے کیلئے بھیا فوج اور بھیا نوکرشاہی کی مدد اور تائید سے نافذ کی تھی بے شک قومی زبان کے طور پر قائم رہتی لیکن اب انہیں دوسرے صوبوں کی طرح اپنی مادری زبان پنجابی ہی کو اپنا ذریعۂ تعلیم اور اندرونِ پنجاب بول چال کی زبان بنانا چاہیے تھا۔ اردو کے سلسلے میں پنجابیوں کے غلط اور جذباتی رویے سے بنگالیوں کو احساس ہُوا کہ اردو پنجابیوں کی زبان ہے۔ انہوں نے بجا طور پر سوچا کہ اگر پنجابیوں کی زبان اردو کو قومی زبان بنایا جاسکتا ہے تو ان کی زبان بنگلہ کو کیوں نہ بنایا جائے جب کہ ملک کی آبادی میں انہیں اکثریت حاصل ہے۔ اگر اہلِ پنجاب نے پنجابی زبان کے ساتھ اُس محبت کا اظہار کیا ہوتا جس کی وہ ہماری ماں بولی ہونے کی حیثیت سے حق دار تھی تو صورتِ حال کبھی نہ بگڑتی، سب پر واضح ہو جاتا کہ اردو اگر بلوچوں کی زبان نہیں، پٹھانوں کی نہیں، سندھیوں کی نہیں تو پنجابیوں کی بھی نہیں۔ اور ان چار صوبوں کے عوام اپنی اپنی ماں بولیاں رکھتے ہوئے بھی اردو کو قومی زبان کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہیں تو پھر بنگالیوں کے لئے بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ماں بولی کے ہوتے ہوئے اردو کو اپنی قومی زبان تسلیم کر لیں۔ میں سب سے پہلے اپنے آپ پر اور اس کے بعد تمام پنجابیوں پر الزام لگاتا ہوں کہ ہم نے اپنی ماں بولی پنجابی سے غداری کر کے نہ صرف پاکستان میں زبان کا مسئلہ کھڑا کیا بلکہ اردو کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر سامراجی مقاصد اور ملکی سطح پر سیاسی جبر اور معاشی استحصال کے احساس کے بعد جس ایک بات نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیے وہ زبان تھی۔

ساتواں باب

پنجاب کی ذمّہ داری

اپنی ذات سے انکار اور صرف پاکستان کا اقرار کر کے پنجاب نے اپنی طرف سے ہمیشہ پاکستان کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آج تک اس کوشش کے دو ہی نتیجے نکلے ہیں۔ اول ' پنجاب کی نئی نسلیں اپنے پنجابی ہونے پر فخر سے محروم ہو گئی ہیں ' کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا کے مصداق وہ پاکستانیت کے چاؤ میں پنجابیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔ دوم ' پاکستان مضبوط نہیں ہُوا ' مضبوطی تو دور کی بات ہے پاکستان ایک مرتبہ ٹوٹ چکا ہے اور اب رہے سہے پاکستان میں جمہوری عمل مفقود ہونے کے باعث صوبوں کے اپنے درمیان اور صوبوں اور مرکز کے درمیان مغالطے اور تضادات بڑھتے بڑھتے نفرتوں اور کدورتوں تک پھیل چکے ہیں چنانچہ خدشہ ہے کہ پاکستان ایک مرتبہ پھر نہ ٹوٹ جائے۔

آج ملک کے چاروں صوبوں کے عوام میں اتفاق رائے اور یکجہتی نہیں۔ ملکی سرحدوں پر مہلک اور مہیب خطرات منڈلا رہے ہیں۔ افغانستان میں روسی فوج کے داخلے کے علاوہ ایران اور عراق کی جنگ سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ پاکستان کسی بیگانی لڑائی میں ملوث نہ ہو جائے۔ اوپر سے بھارت کی روایتی جارحانہ روش جاری ہے اور اس کا اندرونی دباؤ اسے کسی بھی وقت پاکستان کا محاذ کھولنے پر اکسا سکتا ہے۔ ایسے میں باہمی اتفاقِ رائے اور یکجہتی کا فقدان پاکستان کے لئے انتہائی مضر ہے۔ اس حقیقت سے کب تک آنکھ چرائی جا سکتی ہے کہ آج سندھ اور بلوچستان کے دو چھوٹے صوبوں سے بار بار ایسے نعرے اور نظریئے ابھر رہے ہیں جن میں علیحدگی کی

خواہش صاف صاف جھلکتی ہے۔ جہاں تک سرحد کا تعلق ہے سندھ کے مقابلے میں اقتدار میں اور بلوچستان کے مقابلے میں دولت میں بہتر طور پر شرکت کے باوجود جمہوریت سے محروم ہو کر اس کی نئی نسل بے دلی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ ملکی سیاست کے سنجیدہ مبصر محسوس کرتے ہیں کہ آج پاکستان ۱۹۷۱ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُرخطر دور سے گزر رہا ہے۔

مگر پنجاب کیا کر سکتا ہے؟

یہ ہے وہ سوال جو پنجاب میں بسنے والے حساس اور باشعور لوگ ایک دوسرے سے اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں۔ لیکن اس سوال کے اندر ایک اور سوال مضمر ہے کہ پاکستان کو بچانے کی ذمہ داری اکیلے پنجاب پر کیونکر عائد ہوتی ہے؟ ایک طرف تو پنجاب پر یہ اعتراض ہے کہ وہ پاکستان کا تھانے دار اور ٹھیکے دار بنا بیٹھا ہے۔ دوسری طرف چھوٹے صوبوں سے بار بار آواز اٹھتی ہے کہ پنجاب بڑا بھائی ہے' یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ پاکستان کو قائم رکھنے کے لئے کچھ کرے۔

اس بظاہر متضاد لیکن در حقیقت صحیح صورتِ حال (PARADOX) کی تہ میں جائیں تو پتا چلتا ہے کہ آج اگر ہمیں پاکستان کو قائم رکھنا ہے تو واقعی جب تک پنجاب آگے نہیں بڑھتا اور آگے بڑھ کر اپنا سیاسی کردار ادا نہیں کرتا نہ صرف یہ کہ پاکستان نہیں بچے گا' پنجاب کا بھی کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ دراصل ذمہ داری اُسی کی ہوتی ہے جو اسے نباہ سکے۔ خدا کا قانون ہے کہ کسی پر اتنا بوجھ ڈالا ہی نہیں جاتا جو وہ اٹھا نہ سکے۔ پاکستان کے تینوں چھوٹے صوبے مل کر بھی پاکستان میں جمہوریت بحال نہیں کرا سکتے۔ اور اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو ایک اہتمام تو ہرگز نہیں کر سکتے۔ وہ یہ ضمانت نہیں دے سکتے کہ جمہوریت بحال ہو گئی تو ایک بار پھر مارشل لاء نہیں لگ جائے گا۔ جمہوریت کی بحالی اور مارشل لاء کے مستقل خاتمے کی ضمانت اگر کوئی صوبہ دے سکتا ہے تو صرف اور صرف پنجاب دے سکتا ہے۔

کون سا پنجاب؟

وہ پنجاب جس میں وفاق کے بارے میں طرح طرح کے مغالطے اور تضادات پائے جاتے ہیں؟

نہیں۔ ایک نیا پنجاب جو نوکر شاہی کو اپنے کندھوں سے جھٹک کر براہ راست سیاست کو اپنا شعار اور شیوہ بنائے۔ یہ نیا پنجاب اپنے قدموں پر کھڑا ہو گا۔ اسے یہ مغالطہ نہ ہو گا کہ نوکر شاہی اس کی محافظ ہے بلکہ وہ اس حقیقت کا شناور ہو گا کہ نوکر شاہی نے ہمیشہ اس کی پنجابیت پر ضربِ کاری

لگائی ہے تاکہ اس کی رومانوی اور غیر حقیقت پسندانہ پاکستانیت اور اس کی ایک ہی سانس میں خلافت اور اتاترک کی حمایت کرنے والی ملّت پرستی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کی بوٹیاں نوچتی رہے اور کبھی کبھی اپنی کوئی چھوڑی ہوئی ہڈی اس کے آگے بھی ڈال دیا کرے جسے دیکھ کر دوسرے صوبے کہہ اٹھیں کہ لوٹ کے مال سے پنجاب کے عوام کو بھی حصہ ملتا ہے۔

جب تک پنجاب کے عوام نوکر شاہی کو اپنے اوپر سے جھٹک کر اپنی قیادت خود نہیں کرتے پاکستان کے آفاق پر وہی نامرادی مسلط رہے گی جو ۱۹۴۷ء میں اپنے قیام کے وقت سے پاکستان کی تقدیر بنی ہوئی ہے۔ قیام پاکستان سے آج تک نوکر شاہی نے پنجاب کی سیاسی مفعولیت (POLIT-ICAL PASSIVITY) سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر کاٹھی ڈال رکھی ہے۔ ایک مرتبہ پنجاب براہ راست سیاست کرنے کا ارادہ کرلے تو وہ نہایت آسانی سے نوکر شاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتا ہے کہ تمہارا کام نہ تو حکومت کرنا ہے اور نہ میری نمائندگی کرنا۔ تمہارا کام یہ نہیں کہ جس صوبے سے بھی سیاسی' معاشی اور معاشرتی حقوق کے لئے آواز اٹھے تم میرے نام پر وہاں کے عوام پر غداری کی تہمت لگا کر چڑھ دوڑو اور لاٹھی اور بندوق سے یہ آواز دبادو۔ تمہیں پنجاب کے نام پر دھونس اور دھاندلی کا یہ سلسلہ بند کرنا ہو گا۔

مصیبت یہ ہے کہ نوکر شاہی از خود پنجاب کا نام لے یا نہ لے' اس کی صفوں میں پنجابیوں کی عددی کثرت کے باعث اس کی دھونس اور دھاندلی کا الزام خود بخود پنجاب پر آجاتا ہے۔ اور یوں پنجاب کے چند جرنیلوں' تھانے داروں' اہل کاروں اور چودھریوں کی خاطر پنجاب کے پانچ کروڑ بے قصور' بے زبان اور بے قیادت عوام پاکستان بننے سے آج تک مسلسل اور متواتر گالیاں کھاتے چلے آتے ہیں۔

پنجاب کو سیاسی مفعولیت سے نکلنا ہو گا۔ پنجاب کو اپنے سیاسی کندھوں سے نوکر شاہی کو جھٹکنا ہوگا اور پنجاب کو یہ حقیقت تسلیم کرنی ہو گی کہ ملک میں جب بھی مارشل لاء لگتا ہے اس سے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب کو بھی شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ۱۹۵۸ء کا ایوب خانی مارشل لاء تو ایک طرف جس میں کارخانے تو کراچی میں لگے لیکن فائلیں اسلام آباد پہنچ گئیں' ۱۹۷۷ء کے بعد سے آج تک قائم رہنے والے اس بظاہر پنجابی مارشل لاء کو دیکھ لیجئے' ان ادوار میں جتنی سیاسی اور معاشی مار پنجاب کے عوام نے کھائی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر بھی پنجاب چپ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فوج اور نوکر شاہی میں پنجابیوں کی عددی کثرت کی بنا پر اور سفارش کے اس ہمہ گیر نظام کی بدولت

جسے پاکستان میں زبردست ترقی حاصل ہو چکی ہے یہاں کے حکمران طبقوں کے کام نکلتے رہتے ہیں اور انہیں وہ پریشانیاں درپیش نہیں آتیں جو سندھ اور بلوچستان کے حکمران طبقوں کو کسی حد تک لاحق ہوتی ہیں۔ مٹھی بھر پنجابیوں کو فوجی حکومتوں کے دوران ضرور خصوصی فائدے پہنچ گئے ہوں گے لیکن یہ فائدے تو ہر صوبے کے حکمران طبقوں کو پہنچ ہی جاتے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ صوبوں کا کیا بنا؟ میری دانست میں وہ پنجاب جو قیام پاکستان کے وقت ملک کا سب سے خوشحال صوبہ تھا' آج کراچی کی بدولت سندھ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ امیر ہو چکا ہے۔ اب سہولتوں اور نظم و نسق کو لے لیجئے۔ اٹک کا پل پار کر کے سرحد میں داخل ہوں تو دس منٹ کے اندر اندر احساس ہو جاتا ہے کہ اس صوبے میں سڑکوں سے لے کر پولیس تک ہر سہولت پنجاب کے مقابلے میں بہتر ہے۔ پھر پنجاب کو آخر کیا ملتا ہے جو وہ یہ الزام اپنے سر لیتا چلا جاتا ہے کہ فوجی حکومت یا مارشل لاء کے دوران وہ فائدے میں رہتا ہے۔ میری دانست میں تو اس سے اسے سوائے گالیوں کے کچھ نہیں ملتا۔ چھوٹے صوبوں کے لب بھی کچھ ایسے شیریں نہیں لیکن پنجاب ہے کہ گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتا تو وجہ؟ شاید اپنے آپ سے بھاگے ہوئے پنجابیوں کا ضمیر جب انہیں ملامت کرتا ہے تو وہ دوسروں کی گالیاں کھا کر کسی حد تک اپنے ضمیر کے کچوکوں سے بچ جاتے ہیں۔

آج پاکستان پر نوکر شاہی نے اپنا تسلط اس حد تک جما اور بٹھا لیا ہے کہ پاکستان کے وہ دو صوبے جنہیں اس ادارے میں مناسب نمائندگی حاصل نہیں احتجاج کرتے کرتے بغاوت کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ نوکر شاہی کا کام لوگوں کی خدمت کرنا تھا نہ کہ ان پر حکومت کرنا۔ اہلکار خاکی وردی میں ہوں یا مفتی میں' تنخواہ دار ہونے کے ناتے عوام کے نوکر ہوتے ہیں لیکن ہمارے تنخواہ دار نوکروں نے ہماری کیا درگت بنا رکھی ہے' آیئے اس صورتِ حال کو ایک مثال کے رنگ میں دیکھیں:

چار بھائیوں نے مل کر سوچا کہ ایک گھر بنالیں۔ چاروں نے اپنی جمع پونجی سے اینٹ گارا' سیمنٹ' سریا' ریت اور بجری خرید کر ایک جگہ ڈھیر کر دی۔ تب انہوں نے محسوس کیا کہ عمر بھر کی کمائی ہے' کہیں آس پاس کے لڑاکا ہمسائے مکان بننے سے پہلے سامان ہی اٹھا کر نہ لے جائیں اس لئے بہتر ہو کہ ایک چوکیدار ملازم رکھ لیا جائے۔ انہوں نے ایک ہٹا کٹا' بڑی بڑی مونچھوں والا شخص ڈھونڈ نکالا کہ سامان پر پہرہ دیا کرے۔ پہرے دار نے پہلی فرمائش یہ کی کہ اسے امریکہ سے جدید ترین رائفل منگوا کر دی جائے۔ اس نے دلیل دی کہ آس پاس کے ہمسایوں سے بہت خطرہ ہے کیونکہ انہوں نے

روس سے رائفلیں منگوا رکھی ہیں۔ چاروں بھائیوں نے یہ کام بھی کر دیا اور مکان کی تعمیر میں لگ گئے۔ ابھی مشکل سے چار دیواری ہی بنی تھی کہ پہرے دار نے بندوق دکھا کر چاروں بھائیوں کو چار دیواری کے اندر بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگادی اور کہا کہ دیکھو' اگر تم بولے تو زبان کھینچ لوں گا اور باہر نکلنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔ بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ جب اگلے مہینے کی پہلی تاریخ آئی تو چوکیدار نے کنڈی کھٹکھٹائی اور کہا' تنخواہ نکالو!

پاکستان کے حالات میں یہ چاروں بھائی پنجابی' سندھی' پٹھان اور بلوچ ہیں۔ ستم یہ کہ جس پہرے دار کو ملازم رکھا تھا وہ بھی پنجابی ہے۔ اب چار دیواری کے اندر سندھی' پٹھان اور بلوچ مل کر بے چارے پنجابی کا گریبان پکڑے کھڑے ہیں کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے' تمہی نے اس پہرے دار کی سفارش کی تھی اور یہ تمہارا ہی بندہ ہے۔ اب تم ہی اسے ہمارے سر سے اتارو۔

بجلکے الفاظ میں یہی پنجاب کی ذمہ داری ہے۔

مگر کیا پنجاب یہ ذمہ داری نباہ سکے گا؟

وہ تشدد جو تاریخ نے پنجاب کے ساتھ روا رکھا ہے اس نے اسے آہستہ آہستہ "بادشاہی" کرنے کے بجائے "بادشاہوں" کے ہاتھ مضبوط کرنے کا رویہ سکھا دیا ہے۔ کیا پنجاب اس رویے سے چھٹکارا پا سکے گا؟ کیا پنجاب دوسروں کے ہاتھوں استعمال ہونے کی عادت ترک کر سکے گا؟ اور کیا پنجاب سیاسی مفعولیت کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے اور اپنی قیادت آپ کرنے کے لئے تیار ہو گا؟

میں ان سوالوں کا جواب دینے کے بجائے ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ اگر پنجاب ایسا کر گیا تو پاکستان بھی قائم رہے گا اور پنجاب بھی اپنا وقار بحال کرالے گا۔ اور اگر خدانخواستہ وہ ایسا نہ کر سکا تو نہ صرف پاکستان ایک مرتبہ پھر ٹوٹ جائے گا' پنجاب بھی کبھی سر اٹھا کر نہ چل سکے گا۔

اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ میں پنجاب کی بات کر کے کہیں صوبائی تعصب کو ہوا تو نہیں دے رہا اور کیا وہ صوبائی تعصب جو دوسرے صوبوں میں موجود ہے اور پاکستان کے لئے "زہر قاتل" ثابت ہوا ہے میں اسے پنجاب میں بھی پھیلانے کا مرتکب تو نہیں ہو رہا؟ نہیں' ایسا نہیں۔ اس لئے کہ میں پنجاب کو صرف پنجاب کی خاطر نہیں ، پاکستان کی خاطر جاگنے کی دعوت دے رہا ہوں۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو ہے کہ کیا ہم پہلے سندھی' بلوچ' پٹھان اور پنجابی ہیں یا پاکستانی؟ میں اس سوال کا جواب بھی دو ٹوک ہاں یا نہ میں نہیں دے سکتا کیونکہ میں ان دونوں میں سے

پہلے یا بعد کچھ بھی نہیں کیونکہ میں بیک وقت دونوں ہوں۔ پنجاب میری ماں ہے اور پاکستان میرا باپ۔ جب کوئی پیدا ہوتا ہے وہ بیک وقت اپنی ماں اور باپ کا بچہ ہوتا ہے۔ میں بھی اسی طرح بیک وقت پنجاب اور پاکستان کا بیٹا ہوں اور یہی وہ واحد رویہ ہے جسے ہر پنجابی کو اپنانا ہوگا۔ جب تک وہ اپنے آپ سے انکار کرتا رہے گا اپنی شخصیت کو کبھی مکمل نہیں کر پائے گا۔ اسے بیک وقت اپنے پنجابی اور پاکستانی ہونے کا اقرار کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ ہمیشہ یتیم یا پھر مسکین رہے گا' اس دوہرے اقرار کے بغیر وہ جذباتی طور پر مفلوج رہے گا یا ذہنی طور پر نفسیاتی اعتبار سے توانا و تندرست کبھی نہ ہوگا۔

آج تک پنجابی صرف اور صرف باپ کا اقرار کرتا رہا ہے اور ماں کا انکار۔ اب اس کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ بیک وقت ماں اور باپ کا بیٹا بن کر رہے۔ جیسے ہی وہ یہ دوہرا اقرار کرلے گا اسے قیادت کے لئے باہر دیکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کی معذوری اور محتاجی آپ سے آپ خود اعتمادی میں بدل جائے گی اور اس کی پنچایتوں اور چوپالوں' اس کے گلی محلوں' دیہوں' قصبوں اور شہروں سے سیاسی قیادت ابھرنے لگے گی۔ اس نوخیز سیاسی قیادت کا پہلا فرض ہوگا کہ وہ نوکر شاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتادے کہ اسے پنجاب کی گردن پر پیر تسمہ پا بن کر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی وہ پنجاب کی طرف سے دوسرے صوبوں کے ساتھ لاٹھی اور بندوق سے بات کرنے کی مجاز ہے۔

پنجاب نے شروع ہی سے یہ آرزو کی کہ پاکستان کو ایک ایسے خاندان کے طور پر چلایا جائے جس میں سب ایک ہی جگہ کھائیں پکائیں اور مل جل کر رہیں لیکن اس نے یہ اندازہ نہ کیا کہ خاندان کی حفاظت اور خدمت پر مامور ملازمین جن میں پنجابیوں کی عددی کثرت تھی خاندان والوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں۔

اکٹھے رہنے کی یہ خواہش جس قدر قابلِ تحسین تھی' ملازمین کے رویے سے غفلت اتنی ہی ناقابلِ معافی تھی۔ ملازموں کے رویے نے آج نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ خاندان کے کچھ ارکان تو اکٹھے رہنے کے تصور ہی سے کنارہ کش ہو گئے ہیں البتہ ان کی کثرت اب بھی چاہتی ہے کہ مل جل کر تو رہیں لیکن کھائیں پکائیں الگ الگ۔ یا جیسا کہ پنجابی میں کہتے ہیں اپنے اپنے چولہے الگ کرلیں۔

خاندان کی بقا کی خاطر پنجاب کو اس جائز خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر گلی' محلے' گاؤں' قصبے اور شہر میں خاندانوں کی زندگی میں یہ مقام آیا ہی کرتا ہے۔ جو خاندان بروقت

ایسا کر لیتے ہیں وہ نفاق سے بچ جاتے ہیں۔ جو بدقسمت خاندان ایسے کرنے میں تاخیر کرتے ہیں ان کا شیرازہ بالآخر بکھر جاتا ہے۔

ایک ماں باپ کی اولاد کچھ دیر تک ایسا کرتی اور کر سکتی ہے بلکہ گذشتہ صدیوں میں جائنٹ فیملی سسٹم کے تحت بہت دیر تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ سب ایک ہی جگہ کام کرتے' کھاتے پکاتے اور مل جل کر رہتے تھے لیکن آج کے متحرک اور تغیر پذیر معاشرے میں یہ ممکن نہیں رہا۔ معاشرتی تبدیلیوں کی رفتار اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بے حد تیز ہو گئی ہے۔ اکثر خاندانوں میں اول تو شادی ہوتے ہی ورنہ کچھ دیر بعد نوبیاہتوں کو الگ گھر بسانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب یہ کام باہمی رضامندی سے ہوتا ہے تو خاندان کے باہمی کاروبار اور تعلقات پر آنچ نہیں آتی۔ اس کے برعکس اگر ماں باپ یا بہن بھائیوں کی طرف سے اصرار ہو کہ ایک ہی جگہ کھائیں پکائیں تو نہ صرف بعض اوقات یہ ناممکن ہو جاتا ہے بلکہ گھر میں کشادگی کے بجائے کشیدگی اور خوشی کے بجائے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی کشیدگی اور شکایت پیدا ہو یہی بہتر اور مناسب ہوتا ہے کہ نوبیاہتوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنا چولہا الگ کر لیں' اپنے گھر کے خود مختار ہوں۔ باہمی کاروبار' تعلقات اور مرنے جینے میں شرکت کے احساس کو بچانے اور بڑھانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ وہ بھائی جو ایک ساتھ کاروبار کرتے' ایک گھر میں رہتے اور ایک جگہ کھاتے پیتے لیکن ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جب وہ گھر میں اپنے اپنے حصے (PORTION) کے اندر خود مختار ہو گئے تو ان میں دوبارہ پیار اور محبت کا رشتہ قائم ہو گیا' وہ ایک دوسرے کے مرنے جینے کے ساتھی بن گئے اور ان کے باہمی کاروبار نے زبردست ترقی کی میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب ماں باپ کی ضد کے تحت یا بادلِ ناخواستہ یہ کوشش کی گئی کہ سب ایک ساتھ کھائیں پکائیں تو کشیدگی اور شکایت کی انتہا ہو گئی حتیٰ کہ ایک دھماکے کے ساتھ علیحدگی ہوئی' آپس میں تعلقات دوبارہ کبھی استوار نہ ہوئے اور باہمی کاروبار بھی چوپٹ ہو گیا۔

پنجاب دو باتیں جس قدر جلد سمجھ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ چھوٹے صوبے جو کچھ مانگتے ہیں اگر وہ ان کا دستوری حق ہے تو وہ انہیں لازماً ملنا ہی چاہئے۔ اگر یہ حق چھوٹے صوبوں کو عملاً حاصل ہو جائے گا تو لازماً پنجاب بھی اس سے بہرہ ور ہو گا۔ دوسری یہ کہ چھوٹے صوبے اگر دستور سے آگے بڑھ کر کوئی مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا یہ مطالبہ پنجاب سے نہیں' پاکستان سے ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا پوری قوم اور اس کے نمائندوں کا کام ہے کہ صوبوں کو کیا ملے اور کیا

نہ ملے۔ جب بھی کسی صوبے کے مطالبے کے نتیجے میں دستور میں ترمیم ہوگی تو جو کچھ اس صوبے کو ملے گا وہی پنجاب سمیت دوسرے صوبوں کو بھی میسر ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ آبادی کی وجہ سے پنجاب فائدے ہی میں رہے۔

پاکستان کے وفاق میں پنجاب برابر کا ساجھے دار ہے۔ وفاق کی حیثیت ایک مشترکہ کاروبار کی ہے جس میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان چار ڈائریکٹر ہیں۔ آبادی کے مطابق پنجاب کا حصہ پانچ کروڑ کا ہے، سندھ کا دو کروڑ، سرحد کا ڈیڑھ کروڑ اور بلوچستان کا پچاس لاکھ کا۔ گویا نفع نقصان میں ہر ڈائریکٹر اپنی آبادی کے اعتبار سے حصہ دار ہو گا لیکن ادارے کے تمام فیصلے چاروں ڈائریکٹروں کی باہمی رضامندی سے ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دو ڈائریکٹر یا ایک ڈائریکٹر چاروں کی طرف سے سارے فیصلے کر دیا کرے اور جہاں تک ان ڈائریکٹروں کے گھریلو معاملات کا تعلق ہے وہ سب خود مختار ہوں گے۔

اگر پاکستان کو ایک وفاقی ریاست کی طرح چلانا ہے تو پنجاب کو اپنے رویے میں لازماً تبدیلی کرنی ہوگی۔ اگر پنجاب کو پاکستان اپنے سے بھی زیادہ عزیز ہے تو اسے پاکستان کی خاطر اہتمام کرنا ہوگا کہ چاروں صوبے پاکستان کے گھر میں خوش اور خوشحال رہیں۔ یہ اسی صورت ہو سکتا ہے کہ پاکستان کو ایک ایسا گھر بنایا جائے جس کی بیرونی چار دیواری تو ایک ہو لیکن اس کے اندر چار خود کفیل حصے یا انڈی پنڈنٹ پورشن ہوں اور ہر پورشن میں آباد صوبہ اپنے اپنے پورشن کی حد تک خود مختار ہو۔ پنجاب کو چاہئے کہ پاکستان کے گھر میں اپنے آپ کو نہ تو باپ سمجھے اور نہ بڑا بھائی۔ بہتر ہے کہ وہ سندھ، سرحد اور بلوچستان کا جڑواں بھائی بنے اور چاروں بھائی باہمی فیصلوں کی حد تک ایک دوسرے کی برابری تسلیم کریں۔ جہاں تک رزق اور وسائل کی تقسیم کا تعلق ہے وہ گھر کی سطح پر تو ان کی آبادی کی ضروریات کے مطابق ہوگی البتہ اپنے اپنے پورشن کے اندر چاروں خود مختار ہوں گے۔

اس سلسلے میں پنجاب جتنا بھی غور کرے اسے پتا چلے گا کہ جہاں صوبائی خود مختاری دوسرے صوبوں کے لئے ضروری ہے وہاں یہ خود اس کے لئے دوسروں سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ بے شک پاکستان کے چاروں صوبوں کا ایک دوسرے پر بہت انحصار ہے اور یہ انحصار ہی ملکی وحدت کی سب سے بڑی ضمانت ہے لیکن اس انحصار کی کیفیت یہ ہے کہ پنجاب کی ترقی اس کی ضروریات کی بہ نسبت بہت کم ہوئی ہے اور ہوئی ہے تو وہ اس حد تک "یک رخی" ہے کہ اگر اس نے زراعت میں کامیابیاں حاصل کی ہیں تو صنعت کے میدان میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

مثلاً اگر سرحد کو پنجاب کے اناج اور پنجاب اور سندھ کے کمائے ہوئے زر مبادلہ کی ضرورت ہے یا سندھ کو سرحد کی بجلی' پنجاب کے دریاؤں کے پانی اور اس کے کمائے ہوئے زر مبادلہ کی ضرورت ہے یا بلوچستان کو سندھ اور پنجاب کے دریاؤں کے پانی اور ان کے زر مبادلہ کی ضرورت ہے تو ذرا پنجاب کی ضرورتوں پر بھی دھیان دیں کہ جسے اپنے پانی پر کنٹرول حاصل نہیں اس لئے کہ جب ایوب خان کے وقت اس کے دریاؤں کا سودا کیا گیا تو منگلا اور تربیلا اس کی حدوں سے باہر تعمیر ہوئے' اس کے پاس اپنی بجلی نہیں اس لئے کہ وارسک' گدو اور تربیلا اس سے ہٹ کر واقع ہیں۔ اسی طرح اس کے پاس اپنی گیس بھی نہیں جو سوئی بلوچستان سے آتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بندر گاہ سے محروم ہے لوہا اور تیل کراچی ہی کے راستے غیر ممالک سے در آمد ہوتے ہیں۔ پھر ملک کی ساری صنعت کا ستر سے پچھتر فیصد حصہ سندھ میں' کراچی اور اس کے آس پاس نصب ہے اور اب وہاں پاکستان کے سب سے بڑے صنعتی منصوبے سٹیل پلانٹ کے بعد تو یہ شرح پچاسی فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ وہ پنجاب جس میں قیام پاکستان کے وقت ملک کی پچپن فیصد صنعت موجود تھی' اب بڑی حد تک ایک ایسا زرعی علاقہ بن کر رہ گیا ہے جو اپنی کھیتی کا رس چوسنے والی سنڈیوں کو مارنے کے لئے اپنے پسینے کی کمائی کا بہت بڑا حصہ امریکہ سے کیڑے مار دوائیں در آمد کرنے پر صرف کر دیتا ہے پنجاب کو جتنی صوبائی خود مختاری حاصل ہو گی اتنا ہی وہ اپنے وسائل کو جلد از جلد اور بہتر سے بہتر طور پر ترقی دے کر اپنی صنعتی پس ماندگی دور کر سکے گا۔

میں نے پنجاب کے وزیر خزانہ اور وزیر اعلیٰ کے طور پر اس ضمن میں صنعتی ترقیاتی بورڈ جیسے کئی ادارے قائم کئے اور سرکاری اور نجی سرمائے کے اشتراک سے ٹریکٹر اور اخباری کاغذ جیسی ضروری صنعتوں کے قیام کی داغ بیل ڈالی تھی لیکن مضبوط مرکز کے شوقینوں نے ان کاموں کو اچھی نظر سے نہ دیکھا تھا اس لئے کہ مرکز میں سربراہی اور کلیدی سیاسی عہدے غیر پنجابیوں کے ہاتھ میں تھے۔ آج تک مرکز میں متعین پنجابی نوکر شاہی کا کام صرف یہ رہا ہے کہ غیر پنجابی حکمرانوں کا آلہ کار بن کر چاروں صوبوں کے عوام پر سختی اور تشدد کرے۔ صدیوں تک تاریخ کا تشدد سہنے والے پنجابیوں کے لئے یہ سختی پھر بھی قابل برداشت تھی کہ بقول غالب۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

لیکن وہ صوبے جو تاریخ کے تشدد سے نسبتاً محفوظ رہے تھے ان کے لئے پنجابی نوکر شاہی کی سختی

ناقابل برداشت تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ الزام چند پنجابی جرنیلوں اور چند پنجابی کارندوں کے بجائے پنجاب کے پانچ کروڑ عوام پر آجاتا ہے اور انہیں اس صورتحال سے سوائے بدنامی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

آج تمام دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سندھ سے احساس محرومی کی صدائیں زیادہ اٹھ رہی ہیں۔ میں حسد سے نہیں رشک سے کہتا ہوں کہ اس وقت سندھ پاکستان کا سب سے امیر صوبہ ہے۔ اسے اقتصادی نہیں، سیاسی محرومی ہے۔ سندھ کے مقابلے میں پنجاب کی محرومی اقتصادی بھی ہے اور سیاسی بھی۔ بلکہ اس کی سیاسی محرومی بھی سندھ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً اس حد تک تو وہ سندھ کے مماثل ہے کہ اس کے منتخب نمائندے مرکز یا صوبے میں موجود نہیں۔ لیکن سندھ کی ترجمانی کرنے والی سیاسی قیادت تو موجود ہے۔ اس کے برعکس پنجاب کو اپنی ترجمانی کرنے کے لئے کوئی سیاسی قیادت میسر نہیں۔ اب پنجاب کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اس بات پر دل سے رضامند ہو جائے کہ چاروں صوبے پاکستان کی چاردیواری میں اپنے اپنے علاقے کے اندر خود مختار ہوں مگر مرکز کے تمام فیصلوں میں لازماً شریک ہوں۔ اسی میں پاکستان کا بھلا ہے اور اسی میں پنجاب کا بھلا ہے۔

پنجاب کو یہ راستہ اختیار کرنے میں محض اس لئے جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ کہیں یہ صوبائی عصبیت تو نہیں۔ اسے جان لینا اور مان لینا چاہئے کہ اپنے آپ کو قبول کر کے ہی وہ پاکستان کو ایک وفاق کے طور پر قبول کرے گا۔ اور اگر اس نے پاکستان کو ایک وفاق کے طور پر قبول نہ کیا تو پھر نہ پاکستان رہے گا اور نہ پنجاب۔ اگر خدانخواستہ پاکستان کے دوسرے صوبے تنگ آکر، ناراض ہو کر یا پاکستان کی سرحدوں پر منڈلاتے ہوئے خطرات سے شہ اور ترغیب پا کر پنجاب سے الگ ہو گئے تو پاکستان کے چاروں صوبے بالآخر اسی طرح پچھتائیں گے جس طرح آج ایک دوسرے سے جدا ہو کر پاکستان اور بنگلہ دیش پچھتا رہے ہیں اور ان کا بھی وہی حشر ہو گا جو آج پاکستان اور بنگلہ دیش کا ہو رہا ہے کہ دونوں میں مارشل لاء لگا ہے اور دونوں کے عوام شہری آزادیوں کو ترستے ہیں۔ پنجاب بھی دوسرے صوبوں سے کٹ کر پچھتائے گا۔ اور اس کا بھی برا حشر ہو گا۔ چاروں طرف سے زمین میں گھرا ہوا پنجاب جس کے اپنے پاس نہ پانی ہے، نہ بجلی، نہ گیس، نہ لوہا، نہ تیل، نہ صنعت دوسرے صوبوں سے کٹ کر اس کے بازاروں کی رونق ہی نہیں اس کے گھروں کی عزت بھی لٹ جائے گی۔

پنجاب پہلے بھی بار ہا لٹا ہے۔ آج پھر ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں جن سے خطرہ ہے کہ پنجاب کو از

سرنو لوٹ لیا جائے۔ اگر پنجابیوں نے چھوٹے صوبوں کے ساتھ پنجاب کے طور پر بات نہ کی اور ان کے ساتھ مل کر وفاق کو کامیابی سے چلانے کا کوئی راستہ نہ نکالا تو ان کے وہ سارے کھیت اور کھلیان ' کاروبار اور بازار اُجڑ جائیں گے جنہیں پھلتا پھولتا دیکھ کر کچھ مبصرین کے مطابق آج پنجابی کھال مست اور حال مست ہو چکے ہیں۔

صدیوں تک شمال سے جنوب کی طرف حملہ آور آتے اور پنجاب کو تاخت و تاراج کرتے رہے۔ آج ہم نے ان حملہ آوروں میں سے بتیس لاکھ افغانوں کو اپنی سرحدوں کے اندر لا بٹھایا ہے۔ آج ایک غیر حقیقی اور رومانوی پاکستانیت کے پرستار پنجابیوں کو سرحد ' سندھ اور بلوچستان میں بسنے والے اپنے بھائیوں سے تو گلہ ہے کہ وہ پاکستان کی حدود کے اندر اپنے لئے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں۔ انہیں خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں صوبائی خود مختاری پاکستان کیلئے نقصان کا باعث تو نہیں ثابت ہو گی۔ لیکن وہ ان بتیس لاکھ افغان مہاجروں سے بے فکر بیٹھے ہیں اور انہوں نے ان کے خطرناک وجود کو بالکل اسی طرح نظر انداز کر دیا ہے جیسے کبوتر آنکھیں بند کر کے بلّی کے وجود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اگر پاکستان اور اسلام کے نام پر افغان مہاجرین کی ذمہ داری قبول کر لی گئی ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ان کے باعث پاکستان کی سلامتی اور اس کے عوام کی حفاظت خطرے میں پڑ چکی ہے تو پھر ہم پر پہلا حق تو ان بہاری مہاجرین کا تھا جنہوں نے دو مرتبہ پاکستان کی خاطر خون دیا اور گذشتہ چودہ سال سے بنگلہ دیش میں پڑے اس انتظار میں گل سڑ رہے ہیں کہ پاکستان کو کبھی تو غیرت آئے گی۔ اگر بتیس لاکھ غیر پاکستانی مہاجرین کیلئے پاکستان کی سلامتی کو داؤ پر لگایا جا سکتا ہے تو ایک لاکھ پاکستانیوں کو واپس لا کر یہاں کیوں آباد نہیں کیا جا سکتا؟ پنجاب کو پاکستان اور اسلام اتنے ہی عزیز ہیں تو وہ ان بہاریوں کیلئے آواز کیوں نہیں اٹھاتا؟

آخر میں مجھے اسلام کے حوالے سے ایک بات کہنی ہے۔ پنجابی عوام کبھی ملّا کے اسلام کے پیرو کار نہیں رہے۔ ہاں انہوں نے صوفیانہ اسلام کو ضرور دل سے قبول کیا ہے۔ یہ صوفیانہ اسلام تو سکھاتا ہی محبت اور رواداری ہے۔ اور محبت اور رواداری کی اہلیت اسی میں ہوتی ہے جو شجاع اور بہادر ہو ' جو نفسیاتی طور پر اپنے قدموں پر کھڑا ہو۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے سلسلے میں پنجاب کو سب سے پہلے اپنا آپ تسلیم کرنا ہو گا اور شرط اول کے طور پر پنجابی زبان کو ذریعہ ابلاغ ' سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم بنانا ہو گا۔ پھر اسلام میں ریاست کے قیام سے زیادہ ایک معاشرہ ابھارنے کا

رخ اختیار کیا گیا ہے اور یہ معاشرہ ایک دوسرے کے حقوق کو پہچان کر ہی بنتا ہے۔ پاکستان کو ایک متحد و مستحکم ریاست بنانے کیلئے بھی پنجاب کو دوسرے صوبوں کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی امنگوں کا احترام کرنا ہو گا۔ صرف اسی طرح دوسرے صوبے پنجاب کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی امنگوں کا پاس کریں گے اور پاکستان ایک قابلِ قبول اور قابلِ عمل وفاقی ریاست بن سکے گا۔

بہر حال جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا تھا، اسلام میں ریاست کے قیام سے زیادہ ایک معاشرہ ابھارنے کا رخ اختیار کیا گیا ہے اس لئے مسلمان ہونے کے ناتے وفاق ہماری منزل نہیں، نقطۂ آغاز ہے منزل کے طور پر ایک وفاقی ریاست سے آگے بڑھ کر ہمیں ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا اور تشکیل دینا ہے جس میں بیک وقت آزادی بھی ہو اور مساوات بھی۔ آج کی سرمایہ دار ریاستوں نے انسان کو ایک حد تک آزادی تو دی ہے لیکن بڑی حد تک مساوات چھین لی ہے۔ اس کے برعکس اشتراکی ریاستوں میں ایک حد تک مساوات تو پائی جاتی ہے لیکن بڑی حد تک آزادی سے محرومی نظر آتی ہے۔ پاکستان میں آج نہ آزادی ہے نہ مساوات۔ اگر پنجاب کو پاکستان اور اسلام سے واقعی وہ محبت ہے جس کا وہ دعوے دار ہے تو اسے پاکستان کی بقاء کیلئے چاروں صوبوں کے عوام کو ان کے حقوق دلوانے چاہئیں تاکہ پاکستان قائم و دائم رہے اور ساتھ ہی خود مختاری پا کر اپنے اندر اسلام کے اس معاشرے کی داغ بیل ڈالنی چاہئے جس میں ہر شہری کو بیک وقت آزادی اور مساوات میسر ہو۔ اگر اس کوشش میں وہ کامیاب ہوا تو تاریخِ انسانی میں یہ اس کا عظیم ترین شرف ہو گا میرا ایمان ہے کہ وہ محبت اور رواداری اور وہ شجاعت اور دلیری جسے میں نے پنجاب کی روح، اس کی حقیقت، اس کا اصل کردار قرار دیا ہے اس عظیم ترین شرف کے حصول میں ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرے گی۔

آٹھواں باب

پانچ جواں مردِ پنجابی

بے شک تاریخ نے چالیس صدیوں تک پنجاب کے ساتھ ایک مسلسل اور متواتر تشدد روا رکھا لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ہر دور میں پنجاب کی قوتِ حیات نے اس دھرتی کے بطن سے ایسے جواں مرد بھی پیدا کئے جنہوں نے آگے بڑھ کر حملہ آوروں کو للکارا اور تاریخ کو یاد دلایا کہ پنجاب کے خمیر اور پنجابیوں کے ضمیر میں مزاحمت کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔

جب سے انگریزوں نے پنجابیوں سے پنجاب اور پنجابی چھینی' پنجاب کے بارے میں حقائق سامنے آ ہی نہیں سکے ، صرف ملاوٹی اطلاعات پر گزر بسر ہوتی رہی دیہات میں تو ہمارے جوانمرد پنجابی زبان کی وساطت سے یادوں کا حصہ بنے رہے لیکن ہماری شہری آبادی کو صرف پنجاب کی رومانوی داستانوں پر ٹال دیا گیا۔ آزادی کے بعد بھی ہمارے ریڈیو' اور ٹیلی ویژن پر ہمارے سورماؤں کا داخلہ بند رہا۔ ادھر انگریزوں کے ساتھ جو جاگیردارانہ نظام ہمارے دیہات پر مسلط ہُوا اس نے بھی پنجابی رزمیہ شاعری کے بجائے رومانوی شاعری کی سرپرستی کی چنانچہ ہماری نئی نسلوں نے " ونجلی دی مٹھڑی تان " تو پھر بھی سُن لی لیکن انہیں پنجاب کی فضاؤں میں رچی تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں کی جھنکار بہت کم سنائی دی۔

میں یہاں پنجاب کی نئی نسلوں کے لئے پانچ جواں مرد پنجابیوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ میری نسل کے پنجابیوں نے اپنے جوانمردوں پر نہ تو خود فخر کیا اور نہ اپنی اولاد کو صحیح طور پر ان سے متعارف کرایا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں اس مختصری جگہ میں اِن عظیم پنجابی شخصیتوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کر سکوں گا۔ لیکن میں ان کے ساتھ انصاف کرنے سے زیادہ اسوقت اِس فکر میں ہوں کہ کہیں میری نسل کے پنجابیوں کی طرح اگلی آنے والی نسلیں بھی اِن کرداروں کے

ساتھ تعارف سے محروم نہ رہ جائیں۔ ایک مرتبہ ان نسلوں کو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تو پھر یقیناً ان کے ساتھ انصاف کرنے والے قلم بھی حرکت میں آجائیں گے۔

(۱)

راجہ پورس

قدیم یونانی مؤرخین کے مطابق راجہ پورس کی حکومت جہلم اور چناب کے درمیانی علاقے میں قائم تھی۔ پورس کا اصل نام پورو تھا، یونانیوں نے اسے پورس بنادیا۔ جب ۳۲۶ قبل مسیح میں سکندر اعظم نے پنجاب پر حملہ کیا تو وہ پورس کی ذاتی بہادری 'جرات و ہمت اور مزاحمت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ جہاں پورس کے ہمسائے ٹیکسلا کا راجہ امبھی اور کشمیر کا راجہ ابی سار' یونانی فوجوں پر ایک تیر چلائے بغیر گھٹنے ٹیک گئے تھے وہاں راجہ پورس دو سو جنگی ہاتھی' کئی ہزار رتھیں اور کیل کانٹے سے لیس پیادہ سپاہ لے کر مقابلے پر اتر آیا تھا۔ سکندر نے لاکھ چاہا کہ پورس مقابلے سے ہاتھ اٹھا لے' مگر پورس پیدائشی بہادر تھا' وہ مقابلہ کئے بنا دوستی کا ہاتھ بڑھانے یا ہار ماننے کو غیرت کے تقاضوں کے خلاف جانتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس نے سرزمینِ پنجاب کی حفاظت اور اسکے دشمنوں کے خلاف مزاحمت کی قسم اٹھا رکھی تھی۔

سکندر کو برصغیر کی طرف بڑھتا سن کر پورس نے ایرانی بادشاہ دارا کی حمایت کے لئے بھی فوج بھیجی تھی جس کے ایران پہنچنے سے پہلے ہی دارا شکست کھا چکا تھا۔ یوں سکندر بڑھتے بڑھتے پنجاب تک آ پہنچا۔ اردِ گرد کے راجاؤں نے اسکی دہشت سے ہی ہتھیار ڈال دیئے لیکن پورس پنجاب کی اصل مٹی سے بنا تھا' وہ آخر دم تک ڈٹا رہا۔ سکندر اعظم جیسے فاتح عالم کے لئے پورس کی شخصیت اچنبھے کا باعث تھی۔ اسوقت سکندر اپنی عظمت کی بلندیوں پر تھا۔ اسکی فتوحات کی دھاک افریقہ' یورپ اور ایشیا پر بیٹھ چکی تھی۔ وہ ایک ایسے سیلاب کی طرح آگے ہی آگے بڑھتا آرہا تھا جس کے راستے میں کوئی رکاوٹ خلل نہیں ڈالتی۔ امبھی اور ابی سار کے اطاعت گزار رویّے کے بعد اسے پورس کی جانب سے کسی خاص مزاحمت کا خدشہ نہ تھا۔ لیکن پورس تو مرنے مارنے پر تلا کھڑا تھا۔

سکندر نے کئی مہینے جہلم کا دریا عبور نہ کیا بلکہ اپنی جنگی حکمت عملی سے پورس کو خلجان میں ڈالنے کے لئے کبھی اپنی فوجیں دریا کے کنارے کنارے ایک طرف لے جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ اس عرصے میں اس نے پورس کی جنگی طاقت کا اصل راز معلوم کر لیا۔ اسے پتا چل گیا کہ پورس کے تربیت یافتہ جنگی ہاتھی اسکی طاقت کا مرکز ہیں۔ سکندر نے اپنی فوج کو ہاتھیوں سے نمٹنے کی چالیں سکھانی شروع کر دیں۔ اس کے برعکس پورس نے سکندر کی طاقت کا کھوج لگانے کی زحمت نہ اٹھائی جو کہ چاق وچوبند رسالے اور مشاق تیراندازوں پر منحصر تھی۔

ایک طوفانی رات سکندر نے جہلم شہر سے چند میل اوپر دریا کو پار کر لیا۔ پورس کو خبر ملی تو اس نے اپنے دو بیٹوں کو دو ہزار رتھ سواروں کے ساتھ بھیجا۔ مگر سکندر کی بے پناہ یلغار کے سامنے وہ سب کام آگئے۔ آخر "کھڑی" کے میدان میں جہاں آجکل حضرت میاں محمد صاحبؒ کا مزار ہے دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مستند تاریخ دانوں کے مطابق یہ جنگ سکندر کے اہم ترین معرکوں میں سے ایک تھی۔ سکندر نے یہ جنگ جیت لی لیکن اس جنگ نے سکندر کو پورس کا احترام کرنے پر مجبور کر دیا۔

ماہرین بتاتے ہیں کہ شروع میں پورس کے ہاتھیوں کی وجہ سے سکندر کی فوج اور رتھوں کی نقل و حرکت سُست رہی۔ لیکن پورس کے تیراندازوں کے پاس لمبی کمانیں تھیں جنہیں زمین پر ٹیک کر تیر چلانا پڑتا تھا۔ جنگ کے روز بارش کی وجہ سے زمین پھسلواں ہو چکی تھی۔ اسطرح اس کے تیرانداز غیر مؤثر ہو گئے اور یوُں آہستہ آہستہ سکندر کا پلڑا بھاری ہوتا گیا۔ اوپر سے پورس کی رتھیں بہت وزنی تھیں اور وہ بارش کے باعث زمین میں کھُب کھُب جاتی تھیں۔ اسکے برعکس سکندر کے تیرانداز بھاگتے گھوڑوں پر سے تیر چلاتے تھے۔ وہ پورس کے تیراندازوں کے مقابلے میں جب چاہتے پینترا بدل لیتے تھے اور مختلف اطراف سے حملہ کر دیتے تھے۔ پھر اسکی رتھیں بھی ہلکی پھلکی تھیں اسلئے نقل و حرکت میں بہت آسانی تھی۔ پورس کی فوج ڈٹ کر اور جم کر لڑ رہی تھی لیکن سکندر کی سکھائی ہوئی چال کے مطابق اسکے پیادہ سپاہیوں نے پورس کے ہاتھیوں کی سُونڈیں کاٹ دیں جو پلٹ کر خود اپنی ہی فوجوں کو روندنے لگے۔ دونوں طرف کُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ پنجابی فوج کا ایک ایک سپاہی کٹ گیا یا زخمی ہو گیا۔ پورس کو اس حالت میں گرفتار کیا گیا کہ میدان جنگ میں کھڑا یہ جیالا پنجابی آخری آدمی تھا اور اسکے بدن پر تیروں اور تلواروں سے لگے نو بڑے بڑے زخموں سے ایک ساتھ خون بہہ رہا تھا۔

پورس کو سکندر کے سامنے لایا گیا تو گو وہ لہولہان تھا لیکن اسکا سر بلند تھا۔ اسکی آنکھوں میں بدستور

چمک تھی اور اسکے چہرے پر کوئی پریشانی نہ تھی۔ سکندر نے اسے اپنے برابر بٹھایا' دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پورس کا علاقہ اسکے پاس رہنے دیا۔

تاریخ دان سکندر اور پورس کی اس جنگ کو برابری کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ گو پورس کے ہاتھیوں نے بالآخر اسکی اپنی ہی فوج کو روند ڈالا لیکن انہی ہاتھیوں نے ابتداء میں ہزاروں یونانیوں کو بھی کچل کر رکھ دیا تھا۔ سکندر کی فوج اس لڑائی کے بعد سخت دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ سکندر نے دراصل مصلحت کے تحت ہی پورس کو دوست بنایا تھا ورنہ مہینوں کی محنت کے بعد اور ہزاروں ساتھیوں کی جانیں گنوا کر ہاتھ آئے ہوئے علاقے کون واپس کرتا ہے؟ وہ بد دلی جو پورس کے ساتھ اس جنگ نے یونانی فوج میں پھیلا دی تھی جلد ہی رنگ لے آئی۔ جب سکندر بیاس کی جانب بڑھا تو دریا کے دوسرے کنارے ایک اور پنجابی فوج کو مزاحمت کے لئے تیار کھڑا دیکھ کر اس کے سپاہیوں اور سپہ سالاروں نے بالکل ہی دل چھوڑ دیا۔ اسطرح پانچ دریاؤں کے دیس میں ڈٹے ہوئے جوانمرد پنجابیوں نے سکندر اعظم کا رُخ یہاں سے واپس یونان کی طرف پھیر دیا۔ واپسی پر پنجابیوں سے ایک اور جھڑپ میں سکندر کو ایک تیر لگا جو جان لیوا ثابت ہُوا اور یوں ایک پنجابی کے ہاتھوں لافانی دیوتاؤں کی طرح آسمانوں پر جگمگانے والا سکندر پیوندِ خاک ہو گیا۔

(۲)
دُلّا بھٹی

دُلّا کا لفظ عبداللہ کا مخفف ہے۔ پنجاب میں عام رواج ہے کہ پیار سے پورے ناموں کو مختصر کر لیا جاتا ہے چنانچہ عبداللہ کا اختصار دُلّا ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن مجھے اس اختصار میں پیار کے بجائے تحقیر کا شائبہ نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ تاریخ جو مغل بادشاہوں کے دور میں لکھی گئی اور بعد میں انگریزوں نے اسے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت ایک خاص رنگ دیا عبداللہ کو ایک جوانمرد اور سورما نہیں' ایک باغی ڈاکو کے طور پر پیش کرتی ہے اسلئے اس کا نام بگاڑنے بلکہ مٹانے کے درپے رہی ہے۔ ورنہ قومی تاریخ کبھی اتنی بد تمیز نہیں ہوتی کہ اپنے جوانمردوں اور سورماؤں کے نام مختصر کیا کرے۔ اجازت دیجئے، میں احترام کی خاطر اس تحریر میں اپنی دھرتی کے اس عظیم سپوت کو عبداللہ بھٹی ہی کہہ کر پکارنا چاہتا ہوں۔

کچھ روایتوں کے مطابق ایک وقت تھا کہ لاہور سے باہر دریائے راوی کے کنارے سے شروع ہو

کر دریائے سندھ کے کنارے دُلّےؔ والا نزد دریاخان تک کا علاقہ "دُلّے دی بار" کہلاتا تھا۔ بہر حال پنجاب کے اس علاقے میں جسے عبداللہ بھٹی کے دادا کے نام پر ساندل بار کہا جاتا ہے بھٹی خاندان نے ۱۳۳۲ء سے ۱۵۸۹ء (۲۵۷سال) تک حکومت کی ہے۔ شیخوپورہ، فیصل آباد اور سرگودھا کے درمیان پنڈی بھٹیاں اس علاقے کا صدر مقام تھا۔

اپنے عروج کے زمانے میں بھٹی خاندان کی تین نسلوں نے ایک بھرپور کسان تحریک کے تحت مغل شہنشاہیت کے خلاف بغاوت کی۔ یہ بغاوت عبداللہ بھٹی کے دادا ساندل کے عہد میں شروع ہوئی اور اسکے باپ فرید سے ہوتی ہوئی عبداللہ بھٹی کے دور میں نقطۂ کمال کو پہنچی۔

ساندل اور فرید کو باغی قرار دے دیا گیا تھا ان پر الزام تھا کہ وہ لگان نہیں دیتے اور اپنے علاقے سے گزرنے والے ان قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں جو مغلیہ فوج کے لئے رسد لے کر جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ساندل اور فرید ہی نہیں اس علاقے کے تمام کسانوں نے انکی سرکردگی میں مغلیہ شہنشاہیت اور دِلّی کے حکمرانوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا اور بغاوت کر دی تھی پنجاب کے اس خطے کے عوام نہ صرف اپنے علاقے کی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے تھے بلکہ ساتھ ہی انہیں شہنشاہ اکبر کے "دینِ الٰہی" پر بھی شدید اعتراض تھا۔ بے شک پنجابیوں نے کبھی مُلّا کے اسلام کو قبول نہیں کیا اور اسکا ثبوت ہمارے دور میں یہاں قائداعظم اور مسٹر بھٹو کی مقبولیت ہے کہ گو سارے مُلّا ان دونوں کے خلاف تھے لیکن پنجابیوں نے انہیں کامیاب بنایا ہی نہیں، مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی ان کا فیصلہ مُلّا کے خلاف ہی ہوگا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ "دینِ الٰہی" جیسا فریب کھانے کے لئے تیار نہ تھے جس کی حقیقت دین سے زیادہ دنیا کی تھی۔

سولہویں صدی تک تختِ دہلی بہت کمزور ہو چکا تھا اسی کمزوری نے مغل لشکروں کی یلغار کے لئے راستہ کھولا۔ دلی پر یہ یلغار پنجاب کے انہی علاقوں سے ہوتی تھی جو بھٹی خاندان کے ماتحت تھے۔ مغل لشکر فصلوں اور چراگاہوں کو اجاڑ دیتے تھے اور آبادیوں کو لوٹ کر سپاہیوں اور گھوڑوں کے لئے خوراک سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ وہ مزاحمت کرنے والوں کو قتل اور انکی فصلوں کو نذرِ آتش کر دیتے تھے۔

عبداللہ بھٹی کے دادا بجلی خان ساندل اور والد فرید خان بھٹی نے فوجی دستے منظم کر کے مغلوں کے خلاف اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے گوریلا جنگ کی بنیاد رکھی جسے مغلوں، خصوصاً اکبر نے بغاوت کا نام دیا۔ لاہور کی گورنری کے دوران اکبر نے ساندل اور فرید کے خلاف لشکر کشی

کی اور پنڈی بھٹیاں میں قلعۂ فرید کو تباہ کر کے دونوں بھٹی سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ پھر انہیں لاہور لا کر دلی دروازے کے باہر پھانسی دے دی اور بغاوت کو مٹانے کی خاطر انکی لاشوں میں بھُوسہ بھروا کر مختلف باغی علاقوں میں پھروایا۔ ساندل اور فرید کا اپنے علاقے میں اتنا اثر تھا کہ مغل حکمرانوں کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کی لاشیں ساندل بار میں لے جاتے البتہ وہاں دور دور سے خبریں پہنچتی تھیں اور اپنے ان سورماؤں کے ساتھ ہونے والے سلوک پر جوانوں کا خون کھولتا رہتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ عبداللہ بھٹی جوان ہوا۔ وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح نہ صرف بہادر تھا' اسکے دل میں انکے خون کا بدلہ لینے کا جذبہ بھی موجزن تھا اس جذبے نے اسے باپ اور دادا کے مقابلے میں کہیں زیادہ باغی بنا دیا تھا اس نے ساندل بار کے آس پاس کے سارے علاقے میں بغاوت کی آگ پھیلا دی اور پنجاب میں مغلوں کے رسد کے قافلے گزرنے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ جب بھی ان قافلوں کی حفاظت پر مامور مغل سپاہیوں سے عبداللہ بھٹی کی مڈھ بھیڑ ہوتی تھی وہ انکا صفایا کر دیتا تھا۔

اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف نفرت' وطن کی آزادی کے لئے تڑپ' مظلوم کسانوں کے استحصال کے خلاف بغاوت اور باپ دادا کے خون کا انتقام لینے کے جذبے نے عبداللہ بھٹی کی شہرت دور دور تک پہنچا دی۔ اسکی مہمات اور بہادرانہ کارناموں کے چرچے پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ وہ ساندل بار کی سرحدوں کو وسیع کرتا گیا یہاں تک کہ دریائے سندھ کے کنارے تک چلا گیا جہاں میانوالی اور مظفر گڑھ کے درمیان دریا خاں کے قریب دُلّے والا کا قصبہ آج بھی موجود ہے۔ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حاکموں نے بھی بھٹی ریاست کی بالادستی قبول کر لی تھی اور یوں عبداللہ بھٹی اکبر کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔

عبداللہ بھٹی کی باغیانہ جسارتوں پر "مغلِ اعظم" چُپ نہیں سادھ سکتا تھا جب اس نے دیکھا کہ پنجاب کی اس بغاوت سے مغلیہ سلطنت کے دبدبے میں شدید کمی آتی جا رہی ہے تو وہ خود تختِ لاہور پر آ بیٹھا۔ ادھر عبداللہ بھٹی بھی جانتا تھا کہ اب اسکے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس نے بھرپور مزاحمت کے لئے دور و نزدیک کے ساتھیوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اکثر راتوں کو دیر تک جنگی منصوبے بناتے رہتے کہ مغل سلطنت کے عظیم وسائل کے سامنے اپنے سر کو بلند رکھنے کے لئے انہیں کیا حربے اور ہتھکنڈے استعمال کرنے ہونگے۔

کچھ ہی عرصہ بعد عبداللہ کو اطلاع ملی کہ ساندل بار کے شمالی علاقے

میں ایک قافلہ مغلوں کے لئے رسد لیکر جارہا ہے عبداللہ بھٹی اور اسکے ساتھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ کھیتوں ، کھلیانوں ، جنگلوں اور بیابانوں میں سے ہوتے ہوئے وہ دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے رسد کے قافلے تک پہنچ گئے۔ قافلہ تھکا ہوا تھا۔ گو عبداللہ اور اسکے ساتھی بھی دُور سے آئے تھے لیکن ان کے حوصلے بلند تھے۔ انہوں نے محافظ سپاہیوں کو گاجر مُولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا بارہ ہزار کی نفری پر مشتمل مغل قافلہ دیکھتے ہی دیکھتے تتر بتر ہو گیا۔ قافلے کا سردار صوبیدار ملکیرہ دُم دبا کر بھاگ اٹھا۔ عبداللہ بھٹی نے اسکا پیچھا کیا اور تلوار کے ایک وار سے اسکا سر قلم کر کے ایک چادر میں باندھ لیا۔ اس علاقے میں ایک بااثر شخص میدا کھتری تھا جس کی مغل دربار تک رسائی تھی صوبیدار ملکیرے کا سر میدے کھتری کو اس پیغام کے ساتھ پہنچا دیا گیا کہ یہ اکبر بادشاہ کے لئے عبداللہ کا تحفہ ہے جو ساندل کا پوتا اور فرید کا بیٹا ہے اور اپنے باپ دادا کا انتقام لینے کے لئے اپنے جوانمرد ساتھیوں کے ساتھ اس عہد پر کاربند ہے کہ اگر ساندل بار میں کسانوں سے لگان لینے کے لئے مغلوں نے کسی صوبیدار کو بھیجا یا اسکی اجازت کے بغیر رسد کے قافلے ادھر سے گزرے تو انکا بھی یہی حشر ہو گا۔

میدا کھتری لاہور کے دربار اکبری میں پہنچا تو اسوقت بادشاہ کے پاس بڑے بڑے سردار اور قابل اعتماد سپہ سالار بیٹھے تھے۔ واقعات سن کر اکبر آگ بگولہ ہو گیا اور اُسنے اعلان کیا کہ عبداللہ کی سرکشی اور بغاوت کسی صورت برداشت نہیں کی جاسکتی ، اسے لازماً گرفتار کرنا ہو گا۔ پھر اسنے چیلنج دیا کہ کون سورما ہے جو اس باغی کی مشکیں باندھ کر ہمارے دربار میں زندہ پیش کرے۔ اسوقت کے مشہور سردار مرزا نظام الدین نے اسکا چیلنج قبول کر لیا۔ اکبر نے کہا وہ کامیاب رہا تو منہ مانگا انعام پائیگا اور اگر ناکام رہا تو قتل کر دیا جائے گا۔

نظام الدین نے قول تو دے دیا لیکن جوں جوں وہ عبداللہ بھٹی کی شجاعت ، دلیری اور بے خوفی کی داستانیں سنتا اسکا دل بیٹھا جاتا تھا۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی بات تھی ، اگر وہ اپنا عہد نہیں نباہتا تو اکبر کے ہاتھوں اور اگر عبداللہ بھٹی کو گرفتار کرنے نکلتا ہے تو اسکے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔

آخر موقع دیکھ کر نظام الدین سولہ ہزار فوج کے ساتھ ساندل بار کی طرف چلا۔ اس وقت عبداللہ بھٹی دریائے راوی کے کنارے شکار کھیلنے میں مصروف تھا اور پنڈی بھٹیاں میں صرف خواتین اور کچھ ملازمین رہ گئے تھے یا پھر وہاں عبداللہ بھٹی کا بھائی مہرو تھا جسے وہ شہر کی حفاظت کے لئے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ نظام الدین نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مہرو نے مقابلہ کیا اور نظام الدین کے اکتیس چیدہ

چیدہ آدمیوں کو زہر آلود تیروں سے موت کا نشانہ بنا دیا۔ وہ پریشان ہو کر پیچھے ہٹا تو عبداللہ بھٹی کے مخالف بھائی بندوں (شریکوں) نے نظام الدین کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ اسکا ساتھ دیں گے اور اسے پنڈی بھٹیاں سے یوں ناکام نہیں جانے دیں گے۔ نظام الدین پلٹا اور ان "شریکوں" کی مدد سے شہر فتح کر کے عورتوں کو گرفتار کر لیا جن میں عبداللہ بھٹی کی ماں لدّھی اور دونوں بیویاں پُھلراں اور نُوراں بھی شامل تھیں۔

فاتح مغل فوج کامیابی کے پھریرے اڑاتی واپس لاہور کی طرف جا رہی تھی کہ راستے میں ساندل بار کے آخری گاؤں کے سردار لال خان نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور انہیں غیرت دلائی کہ جب ہماری عورتیں لاہور کے مغل دربار میں پیش ہونگی تو سارا پنجاب بے آبرو ہو گا۔ ساتھ ہی اس نے عبداللہ بھٹی کو بھی خبر پہنچائی کہ کیا کچھ بیت چکا ہے۔ عبداللہ انہی قدموں پر لال خان کے پاس پہنچا اور دونوں نے مل کر مغل فوج پر حملہ کر دیا۔ زبردست جنگ ہوئی۔ عبداللہ بھٹی اور اسکے ساتھیوں نے مغل فوج کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر تہ تیغ کر دیا۔ جب نظام الدین کو بھاگنے کی کوئی راہ نہ ملی تو اسنے عبداللہ بھٹی کی والدہ مائی لدھی کے پاؤں پکڑ لئے کہ خدارا ماں بن کر مجھے بچالو۔ مائی لدھی نے اسکی فریاد سن لی اور بیٹے سے کہا کہ نظام الدین کو اپنا بھائی بنا لے' وہ ہمیشہ اسکا تابع رہے گا۔ اکثر شجاع اور دلیر لوگوں کی طرح عبداللہ بھٹی نے بھی یہ بات مان لی۔ کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا آہستہ آہستہ نظام الدین نے عبداللہ بھٹی کا اعتماد جیت لیا۔

عبداللہ بھٹی کو جنون کی حد تک شکار کا شوق تھا اُدھر نظام الدین بھی اس ہنر میں تاک تھا۔ لیکن نظام الدین کا دل صاف نہ تھا۔ ایک دن وہ شکار کے بہانے عبداللہ بھٹی کو ایسے علاقے میں لے گیا جہاں اسے گھیرے میں لیا جا سکتا تھا۔ دراصل اس نے اندر ہی اندر مغل دربار سے مسلسل رابطہ رکھا ہُوا تھا اور ایک پوری فوج اسکے اشارے کی منتظر رہتی تھی۔ عبداللہ کے گھوڑے نے اسے خبردار کیا۔ وہ راستہ بدل کر نکل جانا چاہتا تھا لیکن نظام الدین نے اسے جھُوٹی تسلی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

دشمنوں میں گھر کر بھی عبداللہ بھٹی نے حواس نہ کھوئے اور اکیلی جان دو سو گیارہ مغل فوجیوں کو مار گرایا۔ آخر اسکا گھوڑا دلدل میں پھنس گیا اور وہ گرفتار ہو گیا۔ اسکی مُشکیں کس کے لاہور لایا گیا اور شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اکبر نے اسے سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی لیکن عبداللہ بھٹی نے صاف صاف کہا کہ وہ اپنے باپ فرید اور اپنے دادا

ساندل کے خون سے اور پنجاب کی مٹی سے غداری نہیں کر سکتا اور نہ ہی اکبر کے دینِ الٰہی کو قبول کر سکتا ہے۔ آخر ۲۶ مارچ ۱۵۸۹ء کو لاہور کے محلہ نخاص میں جہاں آجکل نولکھا بازار ہے اسے بر سرِعام پھانسی دے دی گئی اس وقت پنجاب کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ حسین اسکے قریب موجود تھے۔اسکے آخری الفاظ یہ تھے کہ پنجاب کا کوئی غیرت مند بیٹا پنجاب کی مٹی کبھی نہ بیچے گا۔

مغلیہ دور کے سرکاری تاریخ نویسوں نے عبداللہ بھٹی کو ایک ڈاکو اور لٹیرے باغی کے روپ میں پیش کیا ہے لیکن پنجاب کے دیہات میں "دلا بھٹی" کے عنوان سے جو "واریں" اور قصے آج بھی گائے جاتے ہیں ان میں وہ پنجاب کی حریت پسندی کا علم بردار اور اس کسان تحریک کا سربراہ تھا جس کے تحت مغلیہ اہلکاروں کو لگان دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عبداللہ بھٹی کے ہم عصر شاعر مادھو لال حسین نے شہنشاہیت کے دور میں حریت کے گیت گائے اور پنجاب کے ضمیر کو جگائے رکھا اسی طرح پنجاب کے ضمیر کی سلامتی کے لئے عبداللہ بھٹی نے اپنی رگوں کے گرم خون سے حریت کی پروقار تاریخ لکھی۔

(۳)
رائے احمد خان کھرل

پنجاب کا ایک اور جوانمرد رائے احمد خان کھرل ۱۸۰۳ء میں ساہیوال کے گاؤں جھامرہ میں پیدا ہُوا جو آج کے ضلع اوکاڑہ میں گوگیرہ بنگلہ کے قریب واقع ہے۔ احمد خان جوان ہُوا تو کانوں میں انگریزوں کے ظلم و ستم کی کہانیاں پڑنے لگیں۔ وہ ان کہانیوں پر دانت پیتا تو اسکے بزرگ یہ کہہ کر چپ کرا دیتے کہ ابھی وقت نہیں آیا' ابھی تیاری کرو' تیاری کے بغیر اتنے طاقتور دشمن کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا۔

آخر وہ وقت آ گیا جس کا رائے احمد خان کھرل اور اسکے ساتھیوں اور بزرگوں کو مدت سے انتظار تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو دلی میں تشدد اور توپوں کے زور سے دبا دیا تو یہ آگ پنجاب میں بھڑک اٹھی۔ جگہ جگہ فوجی قلعے بننے لگے اور مجاہدینِ آزادی سے جیلیں بھرنے لگیں۔ کمانڈر برکلے اسوقت ساہیوال کا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ اسے علم تھا کہ اس علاقے میں کھرلوں کی بہت بڑی برادری ہے جسکا ایکا انگریز حکومت کے لئے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

جغرافیے کے اعتبار سے کھرلوں کا گڑھ گوگیرہ ہی بنتا تھا۔ برکلے نے وہاں آ کر ڈیرے ڈال دیئے اور کھرلوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں اور فتیانوں کو اس وسیع پیمانے پر پکڑ پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا کہ گوگیرہ ایک بہت بڑی جیل میں بدل گیا۔ جنرل منٹگمری نے برکلے کو ہدایت کی تھی کہ علاقے میں پہنچتے ہی کھرلوں اور ان کے حواریوں کو کنٹرول میں لے لے کیونکہ صرف اسی طرح کامیابی ممکن تھی ورنہ ساہیوال میں کیمپ لگانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی جنرل منٹگمری تھا جس کے نام پر ضلع ساہیوال انگریزوں کے وقت سے لے کر ہمارے اپنے زمانے تک ضلع منٹگمری کہلاتا رہا۔

برکلے کی کارروائی کے جواب میں احمد خان نے راوی پار جھامرہ رکھ میں بسنے والی برادریوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ اگر ہم نے آگے بڑھ کر مردانہ وار مقابلہ نہ کیا تو پنجاب صدیوں تک انگریز کا غلام ہو کر رہ جائے گا۔ احمد خان کی شعلہ بیانی نے علاقے کے تمام مقامی سرداروں کا خون کھولا دیا اور وہ گھوڑوں پر چڑھ کر رات کی تاریکی میں گوگیرہ جیل پر ٹوٹ پڑے۔ ان مقامی سرداروں کو غیر پنجابی تاریخ جانگلی کے نام سے یاد کرتی ہے حالانکہ وہ ہڑپہ تہذیب کے وارث تھے۔

رائے احمد خان کھرل نے رات دو بجے حملہ کیا۔ برکلے کی فوج نے مقابلہ کیا مگر احمد خان نے تمام قیدیوں کو چھڑا لیا۔ احمد خان اور اسکے ساتھیوں کے علاوہ خود قیدی بھی بڑی بے جگری سے لڑے۔ اس لڑائی میں پونے چار سو انگریز سپاہی مارے گئے۔

اس واقعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے پنجاب میں پھیل گئی اور انگریز انتظامیہ کو رائے احمد خاں کھرل کی طاقت سے خوف آنے لگا۔ انہوں نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کر لی۔ اب انگریز کے روایتی سازشی ذہن میں احمد خان کو دھوکے سے گھیرنے اور ختم کرنے کے نئے نئے منصوبے بننے لگے۔

رائے احمد خاں کھرل گوگیرہ جیل کے واقعہ کے بعد مجاہدین کی فوج لیکر آس پاس کے جنگلوں میں جا چھپا تھا مگر برکلے نے ایک کمینی چال چلی اس نے نواحی دیہات میں احمد خاں کے قریبی رشتہ داروں عزیزوں اور بہو بیٹیوں کو حراست میں لے لیا اور اسے پیغام بھیجا کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے ورنہ اسکے گھر والوں کو گولی مار دی جائے گی۔

اس پر رائے احمد خان کھرل پہلی مرتبہ گرفتار ہوا مگر فتیانوں، جاٹوں اور وٹوؤں نے اسکی حمایت میں آواز اٹھانی شروع کر دی ان کی تحریکِ مزاحمت کو تیزی سے جڑ پکڑتے دیکھ کر احمد خان کو چھوڑ دیا گیا البتہ اس پر پابندی لگا دی گئی کہ گوگیرہ بنگلہ کے علاقے سے باہر نہیں جائے گا۔ برکلے

کو ڈر تھا کہ کہیں یہ تحریک راوی پار بھی زور نہ پکڑ جائے۔ مگر احمد خان کے ساتھ جن لوگوں نے پنجاب کی دھرتی کی قسمیں کھائی تھیں ان سے بعید تھا کہ وہ دبک کر بیٹھ جاتے۔

رائے احمد خان کھرل کی سرکردگی میں پنڈال رکھ میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ طے پایا کہ راوی پار کے پنجابیوں کو ساتھ ملا کر ساہیوال کی تمام انگریز چوکیوں پر چاروں طرف سے بیک وقت حملہ کر دیا جائے۔ مگر افسوس کہ کمالیہ کا کھرل سردار سرفراز اور علاقے کا سکھ سردار نیہان سنگھ بیدی دونوں غداری کر گئے۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو سرفراز نے ڈپٹی کمشنر کو خبر پہنچائی کہ احمد خاں اور اسکے وہ ساتھی جو گوگیرہ میں علاقہ بند تھے راتوں رات دریائے راوی پار کر گئے ہیں اور انکا ارادہ ہے کہ تمام انگریز چوکیوں پر ایک ساتھ حملہ کر دیا جائے۔

کمالیہ کے کھرل سردار سرفراز کی رائے احمد خان کھرل سے خاندانی دشمنی تھی اگر اسوقت کمالیہ کے کھرل بھی گوگیرہ اور ساہیوال کے کھرلوں، فتیانوں اور وٹوں کا ساتھ دے جاتے تو عین ممکن تھا کہ پنجاب میں انگریز کے قدم اکھڑ جاتے۔ بہرحال سرفراز کی مخبری پر برکلے نے چاروں طرف اپنے قاصد دوڑا دیئے۔ برکلے خود گھڑ سوار پولیس کی ایک پلٹن لے کر تیزی کے ساتھ راوی کی طرف بڑھا تاکہ رائے احمد خان کھرل کو راستے ہی میں روکا جاسکے۔ ساتھ ہی اس نے سرفراز کے ذریعے کمالیہ کے دوسرے کھرل سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ انکی مدد کریں جسکا انہیں بھرپور صلہ دیا جائے گا۔

انگریزوں نے نیہان سنگھ بیدی کے زیر اثر دیہات میں بھی منادی کرائی کہ اگر وہ رائے احمد خان کھرل کو گرفتار کرانے میں انگریز حکومت کا ساتھ دیں گے تو انہیں انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔

تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود رائے احمد خان کھرل کی دہشت اس قدر تھی کہ گوگیرہ سے سرکاری خزانہ، ریکارڈ اور سٹور، تمام کے تمام، تحصیل کی عمارت میں منتقل کر دیئے گئے اور اسکے ساتھ ہی قیدیوں کو بھی تحصیل کی جیل میں بھیج دیا گیا خدشہ تھا کہ رات کو قیدی مجاہدین کی شہ پر جیل ہی نہ توڑ دیں۔

جب برکلے راوی کے کنارے پہنچا تو رائے احمد خان کھرل پتن پار کر چکا تھا۔ برکلے نے اسکی تلاش میں جھامرہ رکھ کو نذرِ آتش کر دیا۔ ادھر گوگیرہ میں انگریزوں نے مورچہ بندیاں کر لیں۔ کرنل پلیٹین خود لاہور سے اپنی رجمنٹ لے کر آیا۔ اسکے ہمراہ توپیں بھی تھیں۔ اندازہ

کیجئے ، ایک طرف توپیں ، بندوقیں ، گولہ بارود اور بھاری سامان جنگ اور دوسری طرف مجاہدین کے پاس زیادہ تر لاٹھیاں ، تلواریں اور چند سو بندوقیں تھیں جو ریاست بہاولپور سے منگوائی گئی تھیں۔ مجاہدین مکئی اور جوار کے کھیتوں میں چھپتے چھپتے گوگیرہ بنگلہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انگریزوں کو انکا اسوقت پتہ چلا جب وہ ان سے بمشکل چار سو گز کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ لیکن جیسے ہی وہ قریب پہنچے ان پر توپوں کے گولوں اور بندوقوں کی گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ انگریزی فوج نے ان پر دستی بم بھی پھینکے۔

پنجابی مجاہدین آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ انگریزی فوج نے تعاقب کیا لیکن یہ تعاقب اسکے لئے مہلک ثابت ہُوا چنانچہ انگریز واپس آ گئے۔ اس حملے میں مجاہدین کا زیادہ نقصان نہ ہُوا حالانکہ انگریز فوج نے انکے خلاف ہر قسم کا اسلحہ استعمال کیا تھا۔ مجاہدین جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے موضع فتح پور کے آس پاس رُوپوش ہو گئے۔

۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کو اطلاع ملی کہ رائے احمد خان کھرل ایک مرتبہ پھر وٹو سرداروں سے مل کر اپنی جمعیت کو ترتیب دے رہا ہے۔ لاہور میں میٹنگ ہوئی اور برکلے ایک بھاری فوج لے کر مجاہدین پر حملہ آور ہُوا۔ انگریزوں کی پہلی پلٹن مجاہدین کے سامنے آئی تو انھوں نے اسکے چھکے چھڑا دیئے۔ بہت سے انگریز سپاہی مارے گئے۔ اس سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد خان نے بھرپور حملہ کر دیا جس سے انگریز فوج میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا لیکن برکلے کو تازہ کمک پہنچ گئی۔ راوی کی گودی میں جا کر اس نے اپنے سپاہیوں کو روکا جو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ اس نے ان کا حوصلہ بڑھا کر ایک بار پھر لڑنے پر راضی کر لیا۔

اسی اثناء میں رائے احمد خان کھرل بھی تعاقب کرتا ہُوا وہاں آ پہنچا۔ گھمسان کا معرکہ ہوا۔ یہ ایک تاریخی جنگ تھی جس کی اہمیت انگریز کے حاشیہ نشین تاریخ دانوں نے بھی تسلیم کی ہے۔ اس جنگ سے جو راوی کے کنارے تین دن تک لڑی گئی کوئی تین ہزار سے زیادہ حملہ آور فوجیوں کی لاشیں اٹھائی گئیں۔ لڑائی کے دوران پنجاب کا چپہ چپہ گونج اٹھا۔ جوں جوں آس پاس کے جوانمرد پنجابیوں کو خبر ہوتی گئی وہ آ کر انگریزوں کے خلاف احمد خان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔

جنگ کے تیسرے دن جب رائے احمد خان کھرل نے انگریز فوج کا قریب قریب صفایا کر دیا تو للکار کر کہا کہ "فرنگیو 'لاؤ' کہاں ہے تمہاری باقی فوج 'یہ پنجاب ہے دلی نہیں' پنجاب کے بیٹوں کی گردنیں کٹ تو سکتی ہیں 'جھک نہیں سکتیں ـــ" اس للکار کا دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

پنجاب کے مجاہدین آزادی کی جنگ جیت چکے تھے۔ جھامرہ رکھ میں حملہ آوروں کی لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ مگر انگریز ایک مرتبہ پھر لاہور سے بھاری تعداد میں تازہ دم فوج لے آئے۔ رائے احمد خان کھرل نے جنگ جاری رکھی۔ وہ "آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز" کے مصداق سربسجود تھا کہ اسے شہید کر دیا گیا۔ سکھ سردار بیدی اور کھرل سردار سرفراز کی غداری کے باوجود شہید کے بھائیوں اور ساتھیوں نے بر کلے کو ذبح کر کے اسکا انتقام لے لیا۔

میں مانتا ہوں کہ ہماری اپنی صفوں میں خضر حیات ٹوانہ کے جدامجد ملک صاحب خان ٹوانہ جیسے چند جاگیرداروں نے پنجاب میں جنگِ آزادی کی حقیقت کو داغدار کیا لیکن یہ کہنا کہ پنجاب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران انگریز سے تعاون کیا تھا سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ رائے احمد خاں کھرل کی جدوجہد اور شہادت اس الزام کو یکسر ردّ کر کے رکھ دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بیدی سکھ اور کمالیہ کے کھرل اس لڑائی کو رائے احمد خان کھرل کی ذاتی لڑائی نہ سمجھتے اور بڑی بڑی جاگیروں کے لالچ میں فرنگیوں کا ساتھ نہ دیتے تو آج پنجاب کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ پنجاب کے مجاہدینِ آزادی جنہیں ہمارے نکتہ چیں "وفادارانِ انگریز" کہہ کر پکارتے ہیں بڑی دلیری سے لڑے۔ انہوں نے خود بھی آزادی کے لئے جانیں دیں اور اپنے جوان بچوں اور بھائیوں کو بھی اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھا۔

رائے احمد خان کھرل کی تحریکِ آزادی کو ڈھولوں کی شکل میں آج بھی گایا جاتا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں اسکے بارے میں جو قصے بیان کئے جاتے ہیں ان کے تحت تو اسکی گھوڑی ساوی نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگ میں بڑے کارنامے دکھائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب احمد خان دشمنوں میں زیادہ ہی گھر جاتا تھا تو ساوی نو فٹ اونچی اور پندرہ فٹ لمبی چھلانگ لگا کر اسے بچا لے جایا کرتی تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مئی میں شروع ہوئی اور جولائی میں دبا دی گئی۔ انگریز نے دِلّی پر قبضہ کر لیا تو رائے احمد خان نے ستمبر میں اسکے خلاف مہم شروع کی اسطرح اسکی مہم جنگ آزادی کا حصہ بھی تھی اور خالصتاً پنجاب کی آزادی کی جنگ بھی۔ انگریز کو پنجاب میں قدم جمائے ابھی بمشکل دس سال ہوئے تھے کہ پنجابی اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پنجاب کو انگریز کا وفادار کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ پنجاب پر انگریز کے قبضے کے بعد بھی سیالکوٹ ' امرتسر ' جالندھر اور لاہور میں پنجابیوں نے بار بار حریّت کے جھنڈے بلند کئے اور آزادی کے لئے جانیں دیں۔ اسکے برعکس وہ

بھیّا فوج جو پنجاب فتح کرنے کے لئے دلی اور اودھ سے انگریز کے ساتھ یہاں آئی تھی انگریزوں کی خاطر پنجابی حریت پسندوں کو کچلنے کا فریضہ ادا کرتی رہی۔ رائے احمد خان کھرل کے خلاف لڑنے میں بھی اسی بھیّا فوج نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں "بھیّا فوج" کی ترکیب اردو بولنے والے سپاہیوں کے خلاف حقارت کی بنا پر استعمال نہیں کر رہا۔ پنجاب میں اس فوج کے لئے دو ہی نام تھے، بھیّا فوج یا ہندوستانی فوج "ہندوستانی بڑے شیطانی، آکڑ آکڑ پھرتے ہیں" کی طرح کے لوک گیت اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن میں نے مغالطے اور خلجان سے بچنے کے لئے"ہندوستانی فوج" کی ترکیب استعمال نہیں کی کیونکہ قیام پاکستان کے بعد اسکے معنی بدل گئے ہیں۔

(۴)
نظام لوہار

نظام ۱۸۳۵ء میں لاہور اور امرتسر کے درمیان پٹی تحصیل کے علاقے ترن تارن کے قریب پیدا ہوُا۔ اسکا تعلق ایک بہت غریب لوہار گھرانے سے تھا۔ بوڑھی ماں لوگوں کے مختلف کام کاج کر کے نظام کو تعلیم دلا رہی تھی۔ گھر میں جوان بہن تھی نظام سکول میں پڑھتے ہوئے بھی دوسروں سے الگ الگ پھرا کرتا تھا۔ مگر اسکے ہم عصر اور ہم جماعت ہرگز نہ جانتے تھے کہ وہ کیا کچھ کر گزرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔

ارد گرد کی کسان آبادیوں پر بھاری لگان اور بیگار، پھر حکومت کے اہلکاروں کا مفلس کسانوں پر تشدد۔ نظام اکثر اسی سوچ میں گم رہتا کہ عوام کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اسکی وجہ کیا ہے سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ساری برائی کی جڑ انگریز کی غلامی ہے۔

جب نظام نے اپنی بھٹی میں پہلے لوہے کی برچھی ڈھالی اور پھر ایک پستول بھی بنا لیا تو اسکی ماں نے اسے خوب برا بھلا کہا کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ وہ مسکرایا اور چپ رہا۔ اسکے اندر ایک نیا انسان جنم لے رہا تھا۔ اسکے چہرے کی مسکراہٹ اسکے باغیانہ خیالات کا آئینہ بن گئی۔ آہستہ آہستہ سارے سکول اور سارے گاؤں کو پتا چل گیا کہ نظام کے پاس کون کون سے ہتھیار ہیں۔

نظام اپنی باغیانہ سوچوں میں گم رات گئے تک باہر رہا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت اسکے

جذبۂ بغاوت کو پختہ تر کرنا چاہتی تھی چنانچہ ایک رات واپس آیا تو دیکھا کہ ماں مر چکی ہے اور جوان بہن کے کپڑے تار تار ہیں۔ بہن نے بتایا کہ تمہارے پیچھے انگریز پولیس کپتان آیا تھا' اس نے گھر کی تلاشی لے کر تمہاری پستول اور برچھی ڈھونڈ نکالی اور ماں کو اس قدر مارا کہ وہ مر گئی، میں نے مزاحمت کی تو مجھے بھی بری طرح زدوکوب کیا۔

نظام کے لئے یہ واقعہ اسکی زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ اسی رات اس نے اپنی بہن کو ساتھ لے کر جاکر اپنے دوست شفیع سے اسکا بیاہ کر دیا اور خود گھر بار چھوڑ کر ایک اجاڑ حویلی میں پناہ لے لی جو آج تک "کھراں والی حویلی" کے نام سے مشہور ہے۔

دوسری رات نظام تھانے میں پہنچا اور کپتان کول کو قتل کر دیا جس نے اسکی ماں کا خون کیا تھا اور فرار ہو گیا۔ صبح جب انگریز کپتان کے قتل کی خبر علاقے میں پھیلی تو لوگ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ یہ بد طینت گورا کسان عورتوں کی بے حرمتی کرتا اور غریب کسانوں سے بیگار لیتا تھا۔

کپتان کول کے قتل پر ابھی ترنجنوں اور چوپالوں میں بحث جاری تھی کہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس رونالڈ کی مسخ شدہ لاش دھپ سڑی پتن پر روہی نالے میں پائی گئی۔ جب انگریز پولیس وہاں پہنچی تو نظام لوہار کی برچھی رونالڈ کے سینے میں گڑی تھی۔ اسکے بعد انگریز حکومت کے لئے نظام لوہار ایک طعنہ بن گیا اور سارے پنجاب میں نظام کے خلاف اشتہار لگ گئے۔ مبلغ دس ہزار روپے اور چار مربعے زمین حاصل کیجئے، جو نظام کو زندہ یا مردہ گرفتار کرے گا اسے کچہری میں کرسی ملے گی۔

ان اشتہاروں کے مقابلے میں نواحی دیہات میں غریب لوگوں نے یہ دھمکی پھیلا دی کہ جو کوئی نظام کے ساتھ غدّاری کرے گا اسے وہ جان سے مار دیں گے۔ عوام کے نزدیک نظام لوہار کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف پنجاب کی مزاحمت کا علم بن گیا تھا۔

ایک رات پولیس نے تحصیل پٹی کے "ٹبے والے قبرستان" پر چھاپہ مارا مگر نظام اس اڈے کو چھوڑ کر موضع سوہلی کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسکی ملاقات علاقے کے مشہور باغی سوجھا سنگھ کی ماں جیتاں سے ہوئی جو بین کرتی جارہی تھی۔ نظام نے وجہ پوچھی تو جیتاں نے بتایا کہ سوجھا سنگھ کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ نظام نے تسلی دی اور خود سوجھا سنگھ کو چھڑانے کے لئے "ٹبہ کمال چشتی" کی طرف چل دیا۔ پولیس سے مقابلے کے بعد نظام نے سوجھا سنگھ کو چھڑا لیا۔ سوجھا سنگھ کی ماں جیتاں نے نظام کو اپنا بیٹا بنا لیا اور وہ اسی کے پاس رہنے لگا۔ اس کے بعد نظام لوہار اور سوجھا سنگھ نے مل کر اوپر تلے انگریزوں کے چار اعلیٰ پولیس افسروں کو قتل کر دیا۔ وہ انگریز حکومت

کے لئے مصیبت بن گئے۔

ادھر لاہور اور قصور کے درمیانی علاقے ماجھے کے انقلابی "جبرُو" کو نظام کے کارناموں کی خبر ہوئی تو وہ بھی آ کر نظام سے مل گیا۔ دونوں نے انگریز حکومت کے خلاف منصوبہ بنایا اور علاقے بانٹ کر کسانوں کو ساتھ ملانے کے لئے راتوں کو گاؤں گاؤں پھرنے لگے۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ میلوں اور عُرسوں میں جا کر انگریز پولیس افسروں کو قتل کیا جائے اور یہ کہہ کر قتل کیا جائے کہ "پنجاب سے جاؤ"

اسی سلسلے میں نظام لوہار ستلج پار بسنت کے میلے پر جا رہا تھا کہ راستے میں اسے پیاس لگی۔ اس نے میلے میں جاتی ہوئی ایک لڑکی سے لسّی کا کٹورا مانگا۔ لڑکی نے نظام کو لسی دی۔ نظام نے خوش ہو کر اسے کچھ رقم دینی چاہی مگر لڑکی نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ نظام لوہار کا علاقہ ہے یہ رقم میرے کس کام کی' یہ تو وہ چھین لے گا۔ اس پر نظام نے اپنا آپ ظاہر کر دیا اور کہا' پنجاب کی ہر لڑکی میری بہن ہے، میں تو صرف انگریزوں کے خلاف ہوں اور انہیں پنجاب سے نکالنا چاہتا ہوں۔

اس لڑکی کا نام موہنی تھا۔ وہ میلے میں نظام سے پھر ملی اور اسکی کلائی پر راکھی باندھ دی۔ پھر اس نے بتایا کہ اسی ہفتے اسکی شادی ہے۔ نظام نے اسکی شادی پر آنے کا وعدہ کیا مگر میلے سے واپس جاتے ہوئے اس نے انسپکٹر لوئیس کو قتل کر دیا۔ اس سے سارے میلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ مگر اس طرح نظام کا پیغام پنجاب کے دور دراز علاقوں تک پہنچ گیا اور لوگ اسکے مقصد سے ہمدردی کرنے لگے۔

نظام نے چند ساہو کاروں کی حویلیوں پر ڈاکے ڈالے اور بہت سامال اکٹھا کیا اور شادی والے دن یہ سارا مال اپنی منہ بولی بہن موہنی کو دے آیا۔ اگرچہ اسے موہنی کے گاؤں سے فرار ہونے میں بڑی مشکل پیش آئی مگر سوجھا سنگھ اور جبرو جیسے ساتھیوں نے نظام کی مدد کی اور وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اب نظام لوہار پنجاب کی انگریز پولیس کے لئے طعنے سے بڑھ کر ایک خوف بن چکا تھا۔ ایس پی جان لیو نے نظام کو پیغام بھجوا کر اس سے بات چیت کرنی چاہی۔ مگر اصل میں یہ اسے قتل کرنے کی سازش تھی۔ نظام نے اردگرد چھپے ہوئے سپاہیوں کو تاڑ لیا تھا چنانچہ وہ جان لیو کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر نکل بھاگا اور تین ماہ تک چھانگا مانگا کے جنگلوں میں جبرو کے پاس چھپا رہا۔ مگر پھر سوجھا سنگھ کی

ماں میتاں کی بیماری کی خبر سن کر واپس سوہلی آ گیا۔

اسی اثناء میں نظام کو معلوم ہُوا کہ سوجھا سنگھ ساتھ والے گاؤں "جتاں دا کھوہ" کی ایک لڑکی چھیاما چھن سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ نظام کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے چھیاما چھن کو بلا کر سخت سست کہا۔ نظام کا خیال تھا کہ عشق انسان کو بزدل بنا دیتا ہے اور عشق کے چکر میں سوجھا سنگھ پولیس کے ہاتھ آ سکتا ہے۔

چھیاما چھن نے سوجھا سنگھ کے کان بھرے تو وہ نظام کے خلاف ہو گیا۔ دس ہزار روپے کا نقد انعام اور چار مربعے زمین پر اسکا دل للچا گیا چھیاما چھن نے سوجھا سنگھ سے کہا تھا کہ دیکھ 'قتل تو نظام کرتا ہے مگر پھانسی ساتھ میں تجھے بھی ہو جائے گی۔

سوجھا سنگھ نے تھانہ بھیڑیالہ میں اطلاع دے دی کہ نظام لوہار آج ہمارے ہاں ہے اور کل کالے کھوہ واپس چلا جائے گا۔ نظام لوہار جس کمرے میں سویا ہوا تھا دو گھنٹے کے اندر اندر اسے پولیس نے گھیرے میں لے لیا اور چند سپاہی کمرے کے اوپر چڑھ کر کمرے کی چھت توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ نظام کو پتا چل گیا۔ اس کی گھوڑی کمرے ہی میں بندھی تھی وہ فوراً سوار ہُوا۔ اس نے سر پر لوہے کا تانبیہ اوڑھ لیا تا کہ گولیوں سے بچ سکے مگر اس طرح اسے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ اس نے گھوڑی کو بھگانے کے لئے سیٹی ماری گھوڑی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تو لوہے کا تانبیہ چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔ نظام بے ہوش ہو کر کمرے کے اندر گر پڑا۔ پھر کیا تھا، پولیس اڑتالیس گھنٹے تک اس کمرے پر گولیاں برساتی رہی تیسرے دن نظام کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے قصور سول ہسپتال میں لایا گیا۔

اپنے سورما کی لاش دیکھنے کے لئے دور دراز سے پنجابی عوام ہزاروں کی تعداد میں قصور پہنچے۔ اس موقع پر حکومت نے اعلان کر دیا کہ جو شخص نظام لوہار کی نماز جنازہ میں شریک ہو گا اسے دو روپے ادا کرنے ہونگے۔ اس کے باوجود لوگوں نے جوق در جوق نماز جنازہ پڑھی اور نتیجے میں پینتیس ہزار روپیہ اکٹھا ہوا جو آج کے پینتیس لاکھ سے بھی زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ حاضرین نے نظام کی قبر پر عقیدت اور احترام کے طور پر اس قدر چادریں چڑھائیں کہ اسکی قبر پھولوں کا ایک پہاڑ بن گئی۔ پنجاب کے اس جوانمرد کی قبر قصور کے بڑے قبرستان میں موجود ہے۔

جب میتاں کو پتا چلا کہ اسکے بیٹے سوجھا سنگھ نے نظام کی مخبری کی ہے تو اس نے سوجھا سنگھ کو بلا کر جبرو کے سامنے اسے خود گولیوں سے چھلنی کر دیا اور اسکی لاش پر کھڑے ہو کر کہا، میں کبھی

تمہیں اپنی دھاریں نہیں بخشوں گی کیونکہ نظام کی مخبری کر کے تم نے پنجاب کے ساتھ غداری کی ہے۔

(۵)

بھگت سنگھ

بھگت سنگھ ہمارے اپنے دور میں جدوجہدِ آزادی کا ہردلعزیز ہیرو تھا۔ وہ ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ ضلع فیصل آباد (لائل پور) کے موضوع بنگہ میں پیدا ہوُا۔ باپ دادا بھی آزادیٔ وطن کے دلدادہ تھے۔ جس سال بھگت سنگھ پیدا ہوُا اس کے چچا اجیت سنگھ کو "پگڑی سنبھال جٹا" تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ خاندان کے نئے چشم وچراغ کا نام بھاگاں والا رکھا گیا جو بعد میں بھگت سنگھ بن گیا۔ اب یہی نام مشہور ہے۔

بھگت سنگھ نے ہوش سنبھالی تو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے لے کر جلیانوالہ باغ تک کے خونیں واقعات دیکھے سنے۔ اس کی حساس طبیعت پر ریشمی رومال تحریک اور غدر پارٹی کے انقلابیوں کی شہادت جیسے واقعات کا گہرا اثر پڑا۔ اور وہ انقلابی کارروائیوں کی مدد سے گوراشاہی کو ملک بدر کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔

سکول کی تعلیم مکمل کر کے بھگت سنگھ کالج میں پہنچا تو اسکی دوستی چندر شیکھر آزاد جیسے انقلابیوں سے ہو گئی۔ ۱۹۲۷ء میں اسے لاہور دسہرہ بم کیس کے ضمن میں گرفتار کر لیا گیا اور شاہی قلعے کی بدنامِ زمانہ تشدد گاہ میں رکھا گیا۔ اسوقت وہ بمشکل بیس سال کا ہوگا وہاں سے وہ ضمانت پر رہا ہوُا تو اس نے پہلے نوجوان بھارت سبھا کی بنیاد رکھی اور پھر سوشلسٹ ری پبلکن پارٹی بنائی۔ ساتھ ہی اس نے ایک رسالہ "کرتی" بھی جاری کیا جس کی ادارت سوہن سنگھ جوؔش کو سونپی۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد پر ملک بھر میں مخالفانہ مظاہرے ہوئے اور ہڑتالیں ہونے لگیں۔ ایک مظاہرے پر جس کی قیادت لاہور کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے لاٹھی چارج ہوُا۔ لاجپت رائے زخمی ہو گئے اور اسی حالت میں دم توڑ گئے۔ پنجاب میں چار سُو غم وغصہ کی شدید لہر دوڑ گئی۔

بھگت سنگھ اور اسکے ساتھیوں نے اس قتل کا بدلہ لینے کا عہد کیا چنانچہ انہوں نے جلوس پر

لاٹھی چارج کرنے والے پولیس کپتان سانڈرس کو نشان زد کیا اور ۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو اسے پولیس ہیڈ کوارٹرز کے سامنے کھلے عام گولی مار کر ہلاک کر دیا اور خود روپوش ہو گئے۔ ملزموں پر انکی غیر حاضری میں قتل، دہشت گردی اور سازش کا مقدمہ چلایا گیا۔

اس دوران بھگت سنگھ کے کئی ساتھی راوی دریا کے کنارے درختوں کے مشہور "ذخیرے" سے پکڑے گئے۔ پھر اپریل ۱۹۲۹ء میں جبکہ دہلی اسمبلی ہال میں اجلاس ہو رہا تھا بھگت سنگھ اور اسکے ساتھی پی' کے' دت کو ہال میں بم پھینکنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ بھگت سنگھ اور اسکے ساتھیوں کے جرأت مندانہ اقدامات نے ہندوستان کے عوام میں آزادیٔ وطن اور انقلاب کی تازہ روح پھونک دی۔ وہی تحریک جو ۱۹۲۱ میں دبی دبی تھی ۱۹۲۹ء میں انقلاب آفریں سیاسی مظاہروں میں بدل گئی۔

لاہور سازش کیس قریب قریب گیارہ ماہ تک چلتا رہا۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران عوام اور ملزموں کی نعرہ بازی سے انگریز حاکم خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔ آخر اکتوبر ۱۹۳۰ء میں وائسرائے کے ایک خاص آرڈیننس کے تحت مقدمے کی سماعت بند کمرے میں ہونے لگی جس میں ملزموں یا گواہوں کی حاضری بھی ضروری نہ تھی۔ یہ تھا انگریز کے انصاف اور سیاسی آزادی کا دیوالیہ پن۔ عدالت کے واحد مقامی جج نے جس کا نام غالباً سجاد حسین تھا عدالت کے غیر منصفانہ رویئے کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دیدیا۔ بہرحال نام نہاد عدالت نے بھگت سنگھ اور اسکے جری ساتھیوں، راج گورو اور سکھ دیو وغیرہ کو پھانسی کی سزا سنادی۔ اسطرح بھگت سنگھ ملکی آزادی کے لئے انقلاب کا پہلا نعرہ لگانے والا عوامی ہیرو بن گیا۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں کراچی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز حکومت سے بات چیت کرتے وقت کانگریس بھگت سنگھ اور اسکے ساتھی سورماؤں کی رہائی کا مطالبہ کرے گی۔ مگر کانگریس نے اسطرف توجہ ہی نہ دی۔ الٹا انہی دنوں گاندھی ارون سمجھوتہ طے پایا جس میں گاندھی جی نے انقلابیوں سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ انگریز کو اس سے مزید حوصلہ ہوا۔ آخر کانگریس کے اجلاس کے دوران ہی اس سرفروش انقلابی کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اسوقت اسکی عمر بمشکل چوبیس سال تھی۔

کہتے ہیں کہ پھانسی کے وقت بھگت سنگھ نے پھانسی کے پھندے کو چوم کر اپنے گلے کا ہار بنالیا تھا اور انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے تھے۔ بھگت سنگھ کی پھانسی کی خبر سے لوگوں میں بے

پناہ بے چینی پھیل گئی۔ وہ ایک بڑے ہجوم کی شکل میں سنٹرل جیل لاہور کے باہر جمع ہو گئے۔ اس پر جیل کے حکام نے رات کی تاریکی میں عقبی دیوار پھاڑ کر اس جوانمرد پنجابی کی لاش باہر نکالی اور اسے ستلج کے کنارے چوری چھپے جلا کر راکھ کو فیروزپور کے قریب دریا میں بہا دیا۔

نواں باب

صُوبائی خُودمختاری کامسئلہ

سولہ دسمبر ۱۹۸۳ء کی پریس کانفرنس

آج سولہ دسمبر ہے۔ چند سال پہلے آج کے دن ہم نے پاکستان کو ٹوٹتے دیکھا تھا۔ میں نے اس پریس کانفرنس کے لئے یہ تاریخ اسلئے چنی ہے کہ آج پھر پاکستان کی حالت دگر گوں ہے۔ ایک قہر ۱۹۷۱ء میں نازل ہُوا تھا' ایک قہر اب نازل ہونے کو ہے۔ اور ہم ہیں کہ پاکستان کے اصل مسئلے کو یکسر نظر انداز کر کے دنیا کے ہر مسئلے پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ کسی کو اسلام کی فکر ہے' کسی کو جمہوریت کا غم۔ کوئی کہتا ہے رشوت سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی فرماتا ہے مہنگائی۔ کسی کے نزدیک پاکستانی قومیت کا فروغ سب سے اہم ہے۔ کسی کے نزدیک امن و امان کی حفاظت سرِ فہرست ہے۔ مجھے ان میں سے کسی مسئلے کی بھی اہمیت سے انکار نہیں لیکن میری دانست میں آج پاکستان کا اولین مسئلہ خود پاکستان ہے۔ کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے؟ رہ سکتا ہے تو کیسے؟

کاش میرا ایمان اتنا پختہ ہوتا کہ میں یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا کہ پاکستان چونکہ خدا کے نام پر بنا تھا اسلئے خدا ہی اس کا رکھوالا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن میرے خدا نے مجھے جو آنکھیں دے رکھی ہیں' میں جانتے بوجھتے انہیں کیسے بند کر لوں — آخر انہی بدنصیب آنکھوں کے سامنے ہی تو دنیا کی پانچویں سب سے بڑی مملکت اور دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست دو ٹکڑے ہوئی تھی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان اسلئے ٹوٹا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اس بات پر سمجھوتہ نہ ہو پایا کہ پاکستان کی حدود میں کس طرح اکٹھا رہا جائے تاکہ کسی کو احساسِ محرومی نہ

ہو۔ آج جس قہر کے نازل ہونے کا امکان ہے اس کی بنیاد بھی یہی ہے کہ رہے سہے پاکستان کے چار صوبوں کے درمیان اس بات پر سمجھوتے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی کہ وہ پاکستان کی حدود میں کس طرح اکٹھا رہیں تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

۷۱-۱۹۷۰ء میں بھی مغربی پاکستان میں بسنے والوں نے اصل مسئلے کو نظرانداز کیا تھا۔ آج یہی غلطی پھر دہرائی جا رہی ہے۔ اُسوقت یہاں اسلام اور سوشلزم کی بحث چل رہی تھی' بھارت سے ہزار سال تک لڑنے کا اعلان ہو رہا تھا' امیر اور غریب کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور روٹی' کپڑا اور مکان کے نعرے پر انتخابات جیتے جا رہے تھے مگر کوئی اس مسئلے پر عوام کو اعتماد میں نہ لے رہا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کس طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی سے باہر جناب ولی خاں جیسے چند لوگوں نے ضرور کہا کہ مشرقی پاکستان کی بات سنی جائے۔ لیکن کسی نے اس پر کان نہ دھرا۔ سیاسی تاریخ کے ایک ناچیز سے طالبعلم کے طور پر میرا اپنا یقین بھی یہی تھا کہ پاکستان ایک وفاق ہی کی صورت میں قائم رہ سکتا ہے۔ میرے چند ذاتی دوستوں کو احساس تھا کہ "نصرت" اور "مساوات" کے مدیر اعلیٰ کے طور پر مسٹر بھٹو میری بات سنتے ہیں' ان کے اصرار اور اپنے یقین کی بنا پر میں نے بار بار مسٹر بھٹو سے کہا کہ عام انتخابات سے پہلے اور ان کے بعد مجیب الرحمٰن سے افہام و تفہیم کی راہ نکالیں ورنہ پاکستان نہ بچے گا۔ لیکن بات آگے نہ بڑھی۔

۱۹۷۱ء سے پہلے حالت یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں کسی نے عوامی لیگ اور مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پر افہام و تفہیم تو کیا انہیں غور کے قابل بھی نہ سمجھا۔ اور تو اور مغربی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کے دیرینہ ساتھیوں نے بھی اس سے اور اسکے پروگرام سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ چنانچہ عوامی لیگ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور پھر جلد ہی پاکستان کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔

دو ٹکڑے ہونے کے بعد ۱۹۷۳ء کے آئین میں کوشش کی گئی کہ پاکستان کو ایک قابل عمل وفاق بنایا جائے اور وفاقیت کی روح کے مطابق چاروں صوبوں کو صوبائی خود مختاری دے دی جائے۔ افسوس کہ اس آئین کے معماروں نے خود ہی اس پر عمل نہ کیا اور صوبے احساس محرومی کا شکار ہونے لگے۔ بلوچستان اور سرحد کی وزارتیں تہ و بالا ہوئیں۔ پنجاب میں میرے اور بھٹو صاحب کے اختلافات کی بنیاد بھی صوبائی خود مختاری ہی کا مسئلہ تھا۔ مجھے نہ صرف یہ اعتراض تھا کہ پنجاب کو اسکے آئینی حقوق نہیں دیئے جاتے بلکہ یہ بھی کہ پنجاب کے نام پر چھوٹے صوبوں کو ان کے آئینی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ نہ صرف میرا علم بلکہ ایمان ہے کہ پاکستان صرف اور صرف ایک وفاق کے

طور پر چل سکتا ہے اور وفاق صرف صوبائی خود مختاری دیکر ہی زندہ رہ سکتا ہے اسلئے جو شخص صوبائی خود مختاری کا حامی ہے میرے نزدیک وہ پاکستان کو قائم رکھنا چاہتا ہے اور جو اسکا مخالف ہے اسکی نیت ہو یا نہ ہو میرے نزدیک وہ پاکستان کو توڑنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صوبائی خود مختاری کا مسئلہ وقت پر طے نہ ہونے ہی سے پاکستان پہلے بھی ٹوٹا تھا اور اگر اس مسئلے کے حل میں دیر کی گئی تو پاکستان خدانخواستہ آج پھر ٹوٹ جائے گا۔

آج ملک میں زبردست اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ انتخابات کیسے ہوں اور کس طرح ہوں۔ میں خود اس بات کا حامی ہوں کہ انتخابات جلد از جلد ہو جائیں تاکہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہو سکے یہ ایک بے بدل سچائی ہے کہ دو صوبوں پر مشتمل فوج چار صوبوں کے ملک کو وفاقی انداز سے چلانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی۔ پھر آج کی جغرافیائی اور تزویراتی سیاست کا یہ تقاضا شدید تر ہو گیا ہے کہ ہماری فوج صرف اور صرف ملکی سرحدوں کی حفاظت کا کام کرے۔ یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ فوج کے ضمیر سے اس جُرم کا داغ مٹ سکے کہ ۱۹۷۱ء میں وہ ایسا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ مارشل لاء کی طوالت پاکستان کے لئے زہر قاتل ہے۔ انتقالِ اقتدار کا کوئی قابلِ قبول فارمولا تیار کر کے، سیاسی قیدیوں کو رہا کر کے، معطل شدہ صحافیوں اور استادوں کو بحال کر کے، نظر بند سیاسی رہنماؤں کو پورے ملک میں آنے جانے کی اجازت دیکر، سیاسی جماعتوں سے پابندی اُٹھا کر اور عام انتخابات کا اعلان کر کے ملکی سطح پر جلد از جلد یہ ماحول پیدا کرنا چاہئے کہ چاروں صوبوں کے عوام کا ٹوٹا ہوا مکالمہ جاری ہو جائے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن میں پورے زور سے کہتا ہوں کہ اگر انتخابات کے انتظار کے بہانے وفاق اور صوبائی خود مختاری کے مسئلے کو مزید ملتوی رکھا گیا تو انتخابات ہوں یا نہ ہوں، ہو سکتا ہے کہ ملک باقی نہ رہے۔

شروع شروع میں صوبائی امنگوں اور مطالبوں کے حوالے سے ہونے والے احتجاج کو قابو میں لانا ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ ابتدائی مرحلے پر افہام و تفہیم سے کام لیا جائے تو مسئلے کا حل جلد نکل آتا ہے۔ اسکے برعکس اگر ڈنڈے سے کام لیا جائے تو حالات پہلے پہل تو قابو میں آجاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ لمحہ آجاتا ہے کہ آپ افہام و تفہیم کے لئے کتنی بھی دور جانے کے لئے تیار ہوں دُوری بڑھتی ہی جاتی ہے اور بالآخر دوری نفرت میں اور نفرت علیحدگی میں بدل جاتی ہے۔ ملکی باہمی پہلے دن نہیں بنا کرتی۔ لیکن امنگوں اور مطالبوں کے جواب میں برسنے والا ڈنڈا ایک نہ ایک دن ملکی باہمی بنوا کر رہتا ہے۔

آخری ہی سہی ' آج پھر بھی موقع ہے۔ اجے ڈُلھے بیراں دا کجُھ نہیں گیا۔ احساسِ محرومی نے ابھی احتجاج کی شکل اختیار کی ہے ' بغاوت کی نہیں۔ احساسِ محرومی شدت اختیار کر جائے اور بغاوت کے آثار پیدا ہو جائیں اور ایسے میں حکومت مجبوراً یا بادلِ ناخواستہ انتخابات منعقد کرا دے تو وہ مسئلے کا حل ثابت نہیں ہوتے۔ اسلئے دونوں کام ۔ انتخابات اور افہام و تفہیم ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں تاکہ بغاوت کی آگ بھڑکنے سے پہلے ہی چاروں صوبوں کے منتخب نمائندے اسمبلیوں میں بیٹھ کر باہم طے کر سکیں کہ پاکستان کے وفاق میں صوبوں کا کیا مقام ہو گا۔ لیکن ہمارے سیاستدانوں اور حکومت نے اگر طرزِ انتخاب کی بحث کو مزید طول دینا ہے تو وہ خدارا وفاق اور صوبائی حقوق کے مسئلے پر اسمبلیوں سے باہر ابھی اور فوراً توجہ دینی شروع کر دیں ورنہ دوری اور نفرت مزید بڑھ جائے گی اور احتجاج بغاوت میں بدل جائے گا۔ اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو انتخابات ہوں یا نہ ہوں ' نتیجہ علیحدگی ہوتا ہے ' اتحاد نہیں۔

جب مشرقی پاکستان سے اٹھنے والی چیخ و پکار پر یہاں مغربی پاکستان میں کوئی شنوائی نہ ہوئی اور وہاں مجیب الرحمٰن نے چھ نکات کی بنیاد پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات جیت لئے تو اس کے لئے چھ نکات سے ہٹنا لحظہ بہ لحظہ مشکل تر ہوتا گیا لیکن شروع میں ایسا نہیں تھا۔ میں اس مختصر ٹیم کا کنوینر تھا جس نے انتخابات کے فوراً بعد جنوری ۱۹۷۱ء میں پیپلز پارٹی کی طرف سے عوامی لیگ کی اسی طرح کی ایک ٹیم کے ساتھ مسلسل چار روز تک مجیب الرحمٰن کے گھر میں اُس موضوع پر بات چیت کی تھی کہ انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والی دونوں جماعتوں میں کن امور پر اشتراک رائے پایا جاتا ہے اور کس حد تک اشتراکِ عمل ہو سکتا ہے۔ میاں محمود علی قصوری ' شیخ محمد رشید ' مسٹر جے اے رحیم ' مسٹر حفیظ پیرزادہ میرے ساتھ تھے۔ یہ سب حضرات گواہی دیں گے کہ اگر اس بات چیت کو سنجیدگی سے آگے بڑھایا جاتا تو چھ نکات میں سے بھی کچھ نکات کو کم کرایا جا سکتا تھا۔ انتخابات کے باوجود یہ اسلئے ممکن تھا کہ ابھی مشرقی پاکستان پر ڈنڈا برسنا شروع نہیں ہُوا تھا اور یہ اسلئے ناممکن ہو گیا کہ اُسوقت کے تینوں فریقوں ۔ فوج ' پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ نے آپس میں الگ الگ بات تو کی ' ایک ساتھ بیٹھ کر بات کو کسی منزل تک نہ پہنچایا۔ انتخابات سے پہلے تو کیا ' انتخابات کے سوا سال بعد تک یحییٰ ' بھٹو اور مجیب ایک میز کے گرد اکٹھے نہ ہو سکے اور جب ۲۵/۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکے میں شلجموں پر سے مٹی جھاڑنے کے لئے یہ کوشش کی بھی گئی تو بات نہ بنی اور انتخابات کے باوجود ملک ٹوٹ گیا۔

جس تاریخ سے سبق نہ سیکھا جائے وہ ڈراؤنے خوابوں کی طرح اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی بات نہ سنی گئی تھی۔ آج چھوٹے صوبوں خصوصاً سندھ اور بلوچستان کی بات نہیں سنی جارہی' نہ ہی ان کے حقوق کی ترجمان سیاسی قیادت کو جائز اہمیت دی جا رہی ہے۔ الٹا افہام و تفہیم کے بجائے ڈنڈے سے کام لیا جارہا ہے۔ اُسوقت بھی فوج ہی کی حکومت تھی۔ آج بھی فوج ہی کی حکومت ہے۔ اُسوقت بھی ڈنڈے سے بات نہ بنی تھی' آج بھی نہیں بنے گی۔اُسوقت بھی فوج نے مغربی پاکستان کی طرف سے بات بنانے کا فرض سنبھال رکھا تھا اور مغربی پاکستان کے عوام کو بے خبر رکھا گیا تھا۔آج بھی فوج پنجاب کی طرف سے یہ کام سنبھالے ہوئے ہے اور پنجاب کے عوام کو بے خبر رکھا جارہا ہے۔یہ بے خبری کب تک؟ میرے خیال میں پنجاب کے عوام کو یہ مسئلہ خود حل کرنا ہو گا۔ یہ ان پر تاریخ کا قرض ہے۔ یہ ان کا سیاسی فرض ہے۔ ورنہ وہ قہر جو ٹوٹنے کو ہے ٹوٹ پڑے گا۔اور جب یہ قہر ٹوٹا تو دوسرے صوبوں کا تو شاید کچھ رہ جائے' پنجاب کا کچھ نہ رہے گا۔

گاؤں میں پیدا ہونے والے اور شہر میں ہوش سنبھالنے والے ایک متوسط طبقے کے پنجابی کے طور پر اور پنجاب کے ایک منتخب رکن اسمبلی' وزیر خزانہ' چیف منسٹر اور سینیٹر کے طور پر میں پنجاب میں بسنے والے کروڑوں غریب عوام کی محرومیوں سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ ان کے متعلق ہمیشہ آواز اٹھاتا رہا ہوں۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ پنجاب کے عوام کو بھی اسی وقت ان کے حقوق ملیں گے جب وہ آگے بڑھ کر چھوٹے صوبوں کے عوام کے حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں پاکستان مساوات پارٹی کے پلیٹ فارم سے پنجاب کے عوام کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے اپنا تاریخی قرض نہ چکایا اور اپنا سیاسی فرض نہ نبایا تو نہ صرف پاکستان باقی نہ رہے گا ، خود پنجاب ایک لقمۂ تر کی طرح بھارت کے منہ میں جا گرے گا۔

غیر نمائندہ حکومتوں اور نمائندہ حکومتوں کے غیر آئینی رویوں کے علاوہ ہمارے سادہ دماغ اور کوتاہ نظر سیاستدانوں نے آج ہمیں پھر اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہم سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کھڑے تھے۔ اس سانحۂ عظیم سے دو دن پہلے تک مغربی پاکستان میں خبر دی جارہی تھی کہ ڈھاکہ کے بازاروں میں چہل پہل ہے اور حالات مکمل طور پر قابو میں ہیں۔ مگر پھر ''ملکی سرحدوں کی حفاظت کی پوری پوری اہلیت رکھنے والی فوج'' نے ''غازیٔ ملت'' لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کی سرکردگی میں دنیا کی جنگی تاریخ میں ہتھیار پھینکنے کا ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا تھا اور

حالات کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ یکایک قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔

آج پھر یہی خبر ہے کہ حالات قابو میں ہیں۔ سندھ سے بعض سندھی قائدین تو اہل پنجاب کو پنجابی میں خبریں بھیج رہے ہیں کہ سے خیراں نیں۔ افسوس کہ حکمران اور سیاستدان اصل مسئلے سے ایک مرتبہ پھر دانستہ یا نادانستہ آنکھیں چرا رہے ہیں۔ باہر والے آ کر منہ پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان والی صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے۔ اندر والے اتنے ہی اصرار سے انکار کر رہے ہیں کہ سندھ کی صورتِ حال کو مشرقی پاکستان سے کوئی مماثلت نہیں۔ حضور والا' ڈنڈے سے تو آپ اپنے پیٹ سے نکلی اولاد کو نہیں روک سکتے۔ اولاد کی بات نہ سنی جائے تو وہ بھی باغی ہو جاتی ہے' یہاں تو صوبوں کی بات ہو رہی ہے۔ مشرقی پاکستان ہو یا سندھ اور بلوچستان ہوں' حالات کو ڈنڈے سے قابو میں لانے کی پالیسی کو زیادہ دیر برقرار رکھا گیا تو پاکستان بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکے گا۔ اور نتیجتاً پنجاب کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی ضرورت تو سبھی صوبوں کو ہے۔ مگر پنجاب کو اسکی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ پنجاب بڑا ہے' اسکی ضرورت بھی بڑی ہے۔ پنجاب کی نہروں کو تربیلا اور منگلا ڈیموں سے پانی ملتا ہے جو اس کی حدود سے باہر واقع ہیں۔ پنجاب کو بجلی سرحد اور سندھ سے پہنچتی ہے اور سُوئی گیس بلوچستان سے آتی ہے۔ آج تو پنجابی پیاز کو رو رہا ہے اگر سندھ ساتھ نہ رہا تو ہر دوسری چیز کو روئے گا کیونکہ سٹیل پلانٹ سمیت ملک کی پچاسی فیصد صنعت کراچی اور اسکے آس پاس واقع ہے اور کراچی ہی کے راستے تمام درآمدات خصوصاً لوہا اور تیل باہر سے آتی ہیں۔ پنجاب کو معلوم ہونا چاہئے کہ دوسرے صوبوں سے کٹ کر اسکا کیا حشر ہو گا۔ پانی کے بغیر گندم نہ اگے گی۔ گیس کے بغیر چولہا نہ جلے گا۔ بجلی کے بغیر کارخانہ نہ چلے گا۔ تیل کے بغیر پہیہ جام ہو جائے گا۔ ایسے میں اگر بھارت صرف سکھوں ہی کو اجازت دے دے کہ ننکانہ صاحب اور پنجہ صاحب کی سیر کر آئیں اور اوپر سے تیں لاکھ مسلح افغانی مہاجر بھی مالِ غنیمت سمیٹنے تشریف لے آئیں تو یہاں وہ لوٹ مچے گی کہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی سکھوں کو کھلائی ہوئی دعوتیں اور افغان مہاجرین کی مہمانداری کے باعث حکومتِ پاکستان پر امریکہ کی طرف سے برسنے والے داد کے ڈونگرے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور یہاں کچھ نہ بچے گا۔ نہ ہم بچیں گے' نہ ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت ہی بچے گی۔

میں اس پریس کانفرنس کے ذریعے پنجاب کے دردمند' وسیع القلب' محب وطن' باغیرت لیکن

غریب اور سادہ عوام سے اور اسکے تمام سیاسی کارکنوں اور قائدین سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہوں کہ وہ دوسرے صوبوں میں پائی جانے والی محرومی کو پہچانیں اور تسلیم کریں۔ یہ وہی محرومی ہے جو خود ان کے اپنے علاقوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ پنجاب کے غریب عوام نے کسی صوبے کے غریب عوام کی حق تلفی نہیں کی۔ البتہ پنجاب کے نام پر غیر نمائندہ حکومتوں اور اداروں نے سارے صوبوں کے عوام کا استحصال کیا ہے اور اس میں خود پنجاب کے عوام بھی شامل ہیں۔ پنجاب کے عوام (BY DEFAULT) بدنام ہیں۔ اس بدنامی کا اگر کوئی جواز ہے تو یہ کہ بدی کو روکنے کی کوشش نہ کرنا بدی میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ اسلئے اب تمام پنجابیوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی سیاسی وابستگیوں سے بالا ہو کر ایک ساتھ آواز اٹھائیں کہ جہاں وہ اپنے حقوق لینا چاہتے ہیں وہاں وہ سندھ، بلوچستان اور سرحد کے عوام کے حقوق کی بھی ضمانت دیتے ہیں اور وفاق اور صوبائی خود مختاری کے مسئلے پر ان سے افہام و تفہیم کے لئے تیار ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں چھوٹے صوبوں کی اس قیادت کی ہمنوائی بھی کرنی ہوگی جو پاکستان کو ایک ایسے وفاق کی صورت میں چلانا چاہتی ہے جس میں صوبائی خود مختاری کا مسئلہ سب صوبوں کے عوام کی امنگوں اور ضرورتوں کے مطابق طے پائے اسلئے کہ اگر پاکستان ایک وفاق ہی کی صورت میں قائم رہ سکتا ہے تو صوبائی خود مختاری کی حامی قیادتیں پاکستان کی دشمن نہیں دراصل پاکستان کی دوست ہیں اور اس سے انکار کرنے والی قیادتیں سادہ دلی یا نیک نیتی ہی سے سہی درحقیقت پاکستان کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔

اگر پنجاب کے عوام اور اسکے سیاسی کارکنوں اور سیاسی قائدین نے آج کے سنگین قومی بحران میں اپنے تاریخی قرض اور سیاسی فرض سے چشم پوشی کی تو پھر وہ یاد رکھیں کہ جہاں پاکستان کا قتل ان کے سر ہوگا وہاں وہ اپنے خنجر سے آپ خودکشی بھی کر رہے ہونگے۔

دسواں باب

پانی کا مسئلہ

پانی کے مسئلے نے پنجاب کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور یہ مسئلہ چشمہ جہلم رابطہ نہر کی بندش سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ یہ نہر کالاباغ کے پاس چشمہ کے مقام پر دریائے سندھ سے پانی لے کر دریائے جہلم میں ڈالتی ہے جو اسے تریموں تک پہنچاتا ہے۔ اور پھر یہ پانی میلسی، حویلی، رنگ پور اور بہاول جیسی نہروں کے ذریعے ان علاقوں تک جاتا ہے جنہیں پہلے پنجاب کے تین جنوبی دریاؤں — ستلج، بیاس اور راوی — کے پانی سیراب کرتے تھے۔

۱۸/اپریل ۱۹۸۵ء کو مرکزی حکومت کے ایک مراسلے کے ذریعے چاروں صوبوں کے چیف سیکرٹریوں کو مطلع کیا گیا کہ اس سال خریف کی فصل کیلئے دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم کیونکر ہوگی۔ اس فتنہ انگیز مراسلے کی خاص بات یہ تھی کہ چشمہ جہلم رابطہ نہر کا ذکر یوں گول کر دیا گیا تھا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ مقصود پنجاب پر یہ واضح کرنا تھا کہ وہ کپاس کی بوائی کے دوران تقریباً دو ماہ کے عرصے میں اس نہر سے پانی کی توقع نہ رکھے — دریائے سندھ سے اسے جو پانی ملے گا وہ صرف اور صرف تربیلا ڈیم سے ملے گا اور بس۔ اور اگر یہ ڈیم بھی ایک مخصوص حد تک نہ بھرا تو اسے اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہو گا۔

۱۹۷۴ء میں اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران چشمہ جہلم رابطہ نہر کو باقاعدہ کھلوانے کیلئے میں نے جو زور مارا تھا اتفاق سے وہ پنجاب کے کچھ نیک نفس افسروں کو یاد تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لاکھوں انسانوں اور مویشیوں کے پیاسے مر جانے اور لاکھوں ایکڑ زرعی زمین کے بنجر ہو جانے کے

کھلے کھلے خطرے کے باوجود صوبے کے سربراہوں کو یہ توفیق اور جرات نہیں ہو پا رہی کہ وہ اس مسئلے پر آواز اٹھائیں تو وہ میرے پاس آئے۔ سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کی عادت ہے کہ نوکر شاہی کے مہروں خصوصاً پنجابی افسروں کو کوستے رہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ لوگ اس سلوک کے مستحق ہوتے ہیں لیکن ابھی ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن میں انسانی ہمدردی اور مروت باقی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن دو اہلکاروں نے مرکز اور سندھ میں بیٹھ کر پانی کے مسئلے میں آگ لگا رکھی ہے وہ بھی سیالکوٹ کے پیدائشی مگر بعد ازاں سندھ میں آباد ہونے والے دو پنجابی بھائی ہیں۔ اسی طرح جن حضرات نے مجھے یہ آگ بجھانے کی دعوت دی وہ بھی پنجابی ہی تھے۔ بہر حال جب مجھے واقعات کا علم ہوا تو میں نے ۲۵/اپریل ۱۹۸۵ء کو مندرجہ ذیل اخباری بیان جاری کیا:

"پنجاب کے ایک شہری اور اس کے سابق وزیر اعلیٰ کے طور پر میرے لئے یہ اطلاع انتہائی پریشان کُن ہے کہ وسط اپریل سے وسط جون ۱۹۸۵ء کے دو مہینوں میں پنجاب کے پانچ اضلاع کو نہری پانی سے محروم کر دیا جائے گا جن میں جھنگ، ملتان، وہاڑی، بہاولنگر اور بہاولپور شامل ہیں۔ حکومت پاکستان کے ایک حالیہ فیصلے کے مطابق اس علاقے کے تقریباً تیس لاکھ مربع ایکڑ رقبے کو کپاس کی فصل بونے کیلئے پانی نہ ملے گا۔ یاد رہے کہ اس علاقے میں پاکستان کی ایک تہائی سے زیادہ کپاس اگتی ہے جس کی مالیت تقریباً پانچ سو کروڑ روپے ہوتی ہے۔ کپاس کے علاوہ اس فیصلے سے خریف کی دوسری فصلوں مثلاً گنے اور چاول کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چارے اور باغات کی پیداوار بھی بری طرح متاثر ہو گی۔ خطرہ یہ ہے کہ ان علاقوں کے دیہات میں مویشی اور انسان پینے کے پانی تک سے محروم ہو جائیں گے۔

"حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ عین ان حالات میں کیا ہے کہ جب پنجاب میں گرمی کی زبردست لہر آئی ہوئی ہے اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے نہ تو ٹیوب ویل ہی پوری طرح چل رہے ہیں اور نہ بارشوں کی کمی کے باعث دریائے جہلم اور دریائے چناب ہی میں پانی موجود ہے۔ اس موقع پر جب کہ پنجاب میں پہلے ہی پانی کا قحط ہے اور اس کی نہریں کہیں آدھی اور کہیں تین چوتھائی بہہ رہی ہیں اس کے وسیع رقبوں کو نہری پانی سے محروم کر دینا سراسر زیادتی بلکہ ظلم ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ کسی دوسرے صوبے کی حق تلفی کر کے پنجاب کو زیادہ پانی دیا جائے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ملک میں پانی کی جتنی

بھی کمی ہے اس کا خمیازہ صرف اور صرف پنجاب بھگتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب پانی کی کمی کو باہم بانٹا بھی جاسکتا ہے تو اسے محض پنجاب کے سر کیوں منڈھا جارہا ہے۔

"حکومت پاکستان کے متعلقہ فیصلے کے مطابق چشمہ جہلم رابطہ نہر کو چلنے کی اجازت نہیں دی جارہی۔ اور جب تک یہ نہر نہ چلے دریائے سندھ کا پانی تریموں ہیڈ تک نہیں پہنچتا جہاں سے میلسی، حویلی، رنگ پور اور بہاول جیسی نہروں کو پانی ملتا ہے جو جھنگ، ملتان، وہاڑی، بہاولنگر اور بہاولپور جیسے اضلاع کو سیراب کرتی ہیں۔ چشمہ جہلم رابطہ نہر کا تعلق سندھ طاس کے اس معاہدے سے ہے جو صدر ایوب کے عہد میں بین الاقوامی سطح پر طے پایا تھا۔ اس کے تحت پنجاب کے تین دریا — ستلج، بیاس اور راوی — بیچ دیئے گئے تھے اور ان کے عوض ایک سو کروڑ روپے کے خرچ سے چشمہ جہلم رابطہ نہر نکالی گئی تھی تا کہ پنجاب کی نہروں کو دریائے سندھ سے متبادل پانی مہیا کر دیا جائے۔ چشمہ جہلم رابطہ نہر کا تربیلا ڈیم سے کوئی تعلق نہیں۔ تربیلا تو کہیں بعد میں بنا ہے۔ چنانچہ تربیلا موجود ہو یا نہ ہو، اس میں پانی ہو یا نہ ہو، چشمہ جہلم رابطہ نہر میں دریائے سندھ کا پانی سندھ طاس معاہدے کے مطابق ہر صورت بہنا چاہئے تا کہ اپنے تین دریاؤں سے محروم ہو جانے والا پنجاب اپنے کھیتوں کی پیاس بجھا سکے۔

"حکومت پاکستان نے چشمہ جہلم رابطہ نہر کو دو ماہ کیلئے بند کر کے نہ صرف پنجاب کے عوام کے ساتھ شدید ترین ناانصافی کی ہے جس پر کسی صورت بھی خاموش نہیں رہا جاسکتا بلکہ اس نے ایک بین الاقوامی معاہدے کی بھی صریح خلاف ورزی کی ہے۔ میں پنجاب کے گورنر جیلانی اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواز شریف سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلے کو فوری طور پر صدر ضیاء الحق اور وزیر اعظم جونیجو کے ساتھ زیر بحث لائیں ورنہ پنجاب کے کھیتوں کی پیاس نہ جانے کونسا رنگ اختیار کر جائے۔ پنجاب کو بے زبان سمجھنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب بے زبان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو کسی کی نہیں سنتے۔"

میں نے ذاتی خطوط کے ساتھ اس بیان کی ایک ایک نقل گورنر پنجاب اور وزیر اعلیٰ پنجاب کو بھی بھجوائی اور تجویز کیا کہ اس اہم اور سنگین مسئلے پر پنجاب کی روایتی چپ کا روزہ توڑ دیں اور پنجاب کے حصے کے پانی کیلئے مرکزی حکومت سے دلیرانہ بات کریں۔ مگر نہ تو منتخب ارکان اسمبلی ہی منہ سے کچھ پھوٹے اور نہ صوبے کے سربراہان ہی ٹس سے مس ہوئے۔ البتہ مرکز سے جواب آیا۔

پانی اور بجلی کے وزیر صاحب نے فرمایا کہ نہر تو چل رہی ہے 'ہم نے تو اس کی بندش کا حکم ہی نہیں دیا
دوسروں کی باتوں میں جلد آجانے کے عادی لائی لگ پنجابیوں کو میں خوب جانتا ہوں 'میں نے سوچا یہ لوگ پانی کی کمی اس وقت جا کر محسوس کریں گے جب ان کے بچے اور ڈھور ڈنگران کی آنکھوں کے سامنے پیاس سے تڑپ رہے ہوں گے اور ان کے بھائیں بھائیں کرتے بنجر کھیت منہ اٹھائے انہیں دیکھتے ہوں گے اس لئے کڑوا گھونٹ کر کے پانی کی بات کو بار بار دہرانا ہو گا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ محض آواز اٹھانے سے بات نہ بنے گی، تھوڑا شور بھی مچانا پڑے گا چنانچہ میں نے یکم مئی ۱۹۸۵ء کو اسلام آباد جا کر اس مسئلے پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اسلام آباد ملک کا دارالحکومت ہے' دنیا بھر کے ملکوں کے سفارت خانے بھی یہی ہیں اور افواج پاکستان کے ہیڈ کوارٹرز بھی یہیں قومی اسمبلی اور سینٹ کے اجلاس بھی منعقد ہوتے ہیں۔ راولپنڈی کے اخبارات نے مناسب تعاون کیا اور یوں پہلی مرتبہ اس مسئلے کی گونج اقتدار کے ایوانوں تک پہنچی۔ لاہور واپس آیا تو تین پنجابی ارکان اسمبلی کی جانب سے اخبارات میں ایک بیان دیکھا۔ خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ سوچا کہ شاید پنجابی حمیت جاگ اٹھی ہے پڑھا تو راز کھلا کہ تینوں نے اس صورتحال پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ میں نے پنجاب کیلئے پانی کیوں مانگا ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ پنجاب کی روش تو خاموشی سے دوسروں کے آگے لیٹ جانے کی ہے 'پھر رامے صاحب اسے اپنا حق حاصل کرنے پر کیوں اکسا رہے ہیں 'اس سے تو صوبائی تعصب پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اس پر میں نے پانی کے مسئلے پر ایک اور پریس کانفرنس بلوائی اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی کے نام یہ کھلا خط جاری کیا:

"عزیزان گرامی 'السلام علیکم!

"میں نے ۲۵/اپریل ۱۹۸۵ء کو ایک تفصیلی بیان میں حکومت پاکستان کے اس انتہائی افسوسناک اور غیر منصفانہ فیصلے پر شدید احتجاج کیا تھا جس کے تحت چشمہ جہلم رابطہ نہر کو خریف کے دوران بند کر دیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ لوگوں کیلئے جو پنجاب کے غریب عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پہنچے ہیں یہ خبر تشویشناک ہو گی اور آپ اس کا فوری نوٹس لیتے ہوئے مرکزی اور صوبائی سطح پر حکومت سے اس مسئلے پر باز پرس کریں گے۔ لے دے کر ایک خاتون رکن قومی اسمبلی بیگم عابدہ حسین نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ وزیر اعظم جونیجو سے اس مسئلے پر بات کریں گی۔ اللہ اللہ خیر صلا! تنگ آکر میں نے راولپنڈی جا کر مرکزی حکومت کے بہت قریب سے

دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک پریس کانفرنس کر کے مطالبہ کیا کہ پنجاب کے خلاف اس نا انصافی کا فوری طور پر تدارک کیا جائے۔

"میں نے آپ لوگوں سے پہلے بھی اپیل کی تھی کہ اس مسئلے پر خاموش تماشائی نہ بنیں بلکہ پنجاب کے عوام کی نمائندگی کا حق ادا کریں۔ میں نے گورنر پنجاب اور وزیر اعلیٰ پنجاب کو بھی خط لکھے کہ پنجاب کی ترجمانی کرتے ہوئے صدر پاکستان اور وزیر اعظم پاکستان سے بات کریں۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یقیناً یہ غیرت اور حمیّت کا ایسا شاندار مظاہرہ ہے کہ پنجاب کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

"سیاست دانوں میں سب سے پہلے میں نے یہ رائے دی تھی کہ موجودہ اسمبلیوں کے ارکان کو موقع دینا چاہئے کہ وہ عوام کے اعتماد پر پورا اتریں۔ افسوس کہ آپ نے میری عزت کا کیا خیال کرنا تھا، اپنی عزت کا بھی خیال نہیں کیا اور پانی جیسے نازک مسئلے پر بھی خاموش بیٹھے ہیں۔ مجھے خاص طور پر ان نمائندگان پر حیرت ہوتی ہے جو جھنگ، ملتان، وہاڑی، بہاولنگر اور بہاولپور سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان پانچ اضلاع کے تقریباً ایک کروڑ باشندے اور تیس لاکھ ایکڑ زمین متاثر ہو رہے ہیں۔ اور یہاں پانچ سو کروڑ روپے کے مالی نقصان کا احتمال ہے۔ میں نے تو خیر بھٹو مرحوم کے عہد میں بھی پنجاب کے پانی کیلئے آواز اٹھا کر شاہی قلعے میں تشدّد سہا تھا حالانکہ میں خود ایک مرلہ زمین کا مالک نہیں لیکن آفرین ہے ان علاقوں کے جاگیردار نمائندگان پر جو وزارتوں اور عہدوں کے لالچ میں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ میں ان لوگوں کو تنبیہ کرتا ہوں کہ اس بزدلانہ خاموشی کے بعد نہ صرف ان کا بٹائی میں کوئی حق نہیں بنتا بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان سے زمین چھین کر غریبوں میں بانٹ دینی چاہیئے۔

"عزیزان گرامی!

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ چشمہ جہلم رابطہ نہر کی بندش محض اقتصادی نقصان کا مسئلہ ہے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ویسے تو پانی کی تقسیم کا مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن چشمہ جہلم رابطہ نہر کا تعلق سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کی تقسیم سے ہے ہی نہیں۔ یہ نہر تو بھارت اور پاکستان کے درمیان پانی کی تقسیم کا فیصلہ کرنے کیلئے

بنائی گئی تھی۔ جب ایوب خان کے وقت پنجاب کے تین دریاؤں — ستلج' بیاس اور راوی — کے پانی بھارت کو دے دیئے گئے تو بدلے میں یہ نہر نکالی گئی تاکہ پنجاب کے جنوبی علاقوں کو سیراب کیا جاسکے جو پہلے ان تین دریاؤں اور ان سے نکلنے والی نہروں سے پانی حاصل کرتے تھے۔ یہ نہر سندھ طاس کے بین الاقوامی معاہدے کے نتیجے میں صرف اور صرف پنجاب کو "متبادل پانی" دینے کیلئے وجود میں آئی تھی۔ جہاں تک سندھ یا دوسرے صوبوں اور پنجاب کے درمیان پانی کی تقسیم کا معاملہ ہے وہ تو مرکزی حکومت کے ایوارڈ کا منتظر ہے اب یکایک پنجاب کو جو پہلے ہی اپنی ضرورت کے مطابق پانی حاصل نہیں کرپاتا اس نہر سے محروم کردیا گیا ہے جو اسے ستلج' بیاس اور راوی کے عوض ملی تھی — ظلم یہ ہے کہ پنجاب کے دریا بھی بیچ دیئے اور اس کے بدلے میں جو ایک نہر دی اسے بھی بند کردیا۔ وجہ؟

"عزیزان گرامی! آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ وجہ آپ کی بے حسی اور خاموشی ہے۔ آپ پنجاب کے ووٹوں سے اسمبلیوں میں پہنچے ہیں۔ بے شک ہم سب کا اولین فرض ہے کہ ہم وطن عزیز پاکستان کی سلامتی اور سربلندی کو ہر دوسری بات پر ترجیح دیں۔ لیکن کیا پنجاب اس ملک کا حصہ نہیں؟۔ اور کیا یہاں بسنے والے پانچ کروڑ عوام انسان نہیں؟ کیا آپ ان کے حقوق کیلئے صرف اس لئے آواز نہ اٹھائیں گے کہ لوگ آپ کو متعصب کہیں گے؟ یاد رکھئے اگر آپ نے پنجاب کے حقوق سے غفلت کا یہی رویہ برقرار رکھا تو بالآخر اس کا انجام پاکستان کی تباہی ہوگا۔ کیونکہ جب آپ اپنے حقوق کیلئے آواز نہیں اٹھائیں گے تو دوسرے صوبوں کے لوگ سردار عطاء اللہ مینگل کے الفاظ میں کہہ اٹھیں گے کہ آپ نے پاکستان کو "عظیم تر پنجاب" بنا کر رکھ دیا ہے اور آپ پنجاب کے حقوق کا مطالبہ اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ آپ نے پورے پاکستان پر قبضہ جما رکھا ہے۔

آپ کا مخلص

محمد حنیف رامے

اس عرصے میں ایک دھماکہ ہوا، روزنامہ "نوائے وقت" جاگا اور اس نے اس مسئلے کو اپنی مہم بنا لیا۔ روزنامہ "جنگ" بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا' اس نے پانی پانی کی رٹ لگائی تو وہی مرکزی

وزیر صاحب جو صاف صاف مکر گئے تھے کہ نہر بند ہی نہیں کی گئی پانی پانی ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ نہر تین ہفتے بعد کھول دی جائے گی۔

چشمہ جہلم رابطہ نہر کی بندش نے پنجاب میں اک کربلا برپا کر دی ہے۔ اور جس طرح

؎ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسی طرح اس نہر کی بندش نے پنجابیوں میں پنجابیت کا سویا ہوا احساس زندہ کر دیا ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات کچھ کچھ بیٹھنے لگی ہے کہ میں صوبائی خود مختاری کے سلسلے میں انہیں جو کچھ بتانے کی کوشش کرتا رہا ہوں وہ ایسا غلط بھی نہ تھا' انہیں واقعی جاگنا ہو گا' اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہو گا اور دوسرے صوبوں کے شانہ بشانہ مرکز سے اپنے حقوق مانگنے ہوں گے۔ چنانچہ اب پانی کے مسئلے پر پنجاب اسمبلی نے نہ صرف ایک متفقہ قرارداد منظور کی ہے بلکہ کئی ارکان اسمبلی نے ارادہ ظاہر کیا ہے کہ پانی نہ کھلنے کی صورت میں اسمبلی کے سامنے بھوک ہڑتال کریں گے۔ آیئے ذرا پیچھے چلتے ہیں۔

روزنامہ "نوائے وقت" نے ۲۹/ مئی ۱۹۸۵ء کے اداریے میں لکھا ہے:

"دریائی پانی کی تقسیم کا معاملہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں بھی انہی دو صوبوں (پنجاب اور سندھ) کی حکومتوں میں بحث و نزاع کا موضوع بن گیا تھا اس قضیے کے دوررس اثرات کی زد جناب حنیف رامے پر بھی پڑی تھی کہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے منصب سے ہٹا کر انہیں سینٹ کا رکن بنا دیا گیا"۔

یہاں ایک چھوٹی سی ذاتی وضاحت کی معافی چاہتا ہوں۔ پنجاب کیلئے پانی کا مسئلہ اٹھانے پر جو زد مجھ پر پڑی اس کے نتیجے میں مجھے سینیٹر نہیں بنایا گیا تھا بلکہ آج کے دور کا پنجابی ہونے کے باوجود غیرت اور حمیّت کی جو بیماری مجھے لاحق ہو گئی تھی اس کے علاج کیلئے لاہور کے شاہی قلعے کے مشہور شفاخانے میں بھیجا گیا تھا اور پھر آب و ہوا کی تبدیلی کیلئے سہالہ' اٹک اور کوٹ لکھپت کے بندی خانوں کی سیر کرائی گئی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پنجاب اور پنجابیت کے بڑے بڑے پرچارک بھی ان واقعات سے بے خبری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں جہاں اُس وقت کے جابر سلطان کے دستِ قدرت کا کمال ہے کہ ایسے واقعات کو ہوا ہی نہ لگنے دی جاتی تھی وہاں اس حقیقت کو بھی دخل ہے کہ آج کے پنجابیوں کو احساس ہی نہیں رہا کہ ان میں سے بھی کوئی پنجاب کیلئے قربانی دے سکتا ہے۔ انہیں لے دے کے یہ یاد ہے کہ مجھے بطور سزا سینیٹر بنا دیا گیا تھا حالانکہ سینیٹر تو مجھے مرکز میں ایک "اہم وزارت" پر فائز کرنے کیلئے بنایا گیا تھا اور بھٹو صاحب کے ۲ جولائی ۱۹۷۵ء کے اس تحریری

فرمان کی تصدیق اس وقت کے اٹارنی جنرل مسٹر یحیٰی بختیار نے لاہور ہائیکورٹ میں جسٹس نسیم حسن شاہ کی عدالت میں بہ نفس نفیس پیش ہو کر کی تھی جہاں میں ایک قیدی کے طور پر اپنا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اصل میں اس واقعہ سے خاصا عرصہ قبل جب میں نے لاہور کے نیشنل سنٹر میں وارث شاہ ڈے پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے پنجاب کو دعوت دی کہ اپنے آپ کو پہچانے اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر اپنے قدموں پر کھڑا ہو تو میرے لئے کال کوٹھری کا اسی وقت انتظام ہو گیا تھا۔ لاہور کے گورنر ہاؤس میں اسی رات کھانے پر بھٹو صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ پنجاب میں کسی کو وارث شاہ کا وارث بنتے نہیں دیکھنا مانگتے۔

میں نے ۱۵/مارچ ۱۹۷۴ء کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے طور پر حلف اٹھایا۔ جلد ہی خریف کی فصل کیلئے پانی کی کمی کا سوال پیدا ہو گیا۔ میں نے اگلا پچھلا ریکارڈ چھنوایا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ۱۹۷۱ء سے تعمیر ہو جانے والی چشمہ جہلم رابطہ نہر پر پنجاب کا حق تسلیم کرنے اور کرانے کو مسلسل التواء میں ڈالا جا تا رہا تھا' ون یونٹ ٹوٹنے کا سہارا لے کر صوبہ سندھ نے یہ موقف اختیار کر لیا تھا کہ اول تو یہ نہر سندھ کے مفادات کے منافی تعمیر ہو گئی ہے دوسرے دریائے سندھ کا پانی صوبہ سندھ کیلئے وقف رہنا چاہئے۔ البتہ جب تربیلا ڈیم چالو ہو جائے گا تو پنجاب کو اس میں سے کچھ پانی دیا جا سکتا ہے۔ چشمہ جہلم رابطہ نہر کی تعمیر مکمل ہوئی تو یحیٰی خان پاکستان کے حاکم اعلیٰ تھے۔ انہوں نے از خود فیصلہ کر دیا کہ چشمہ کے ذخیرۂ آب سے پنجاب اور سندھ کو برابر برابر پانی دے دیا جائے۔ جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو مسئلہ دوبارہ اٹھا۔ دریائے سندھ میں سیلاب آیا ہوا تھا اور پانی سمندر میں جا رہا تھا لیکن صوبہ سندھ پھر بھی تیار نہ تھا کہ چشمہ جہلم رابطہ نہر میں پانی جاری کر دیا جائے۔ اس پر ۳/جولائی ۱۹۷۲ء کو صوبائی یکجہتی کے مرکزی وزیر مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ' گورنر پنجاب مسٹر غلام مصطفےٰ کھر اور وزیر اعلیٰ سندھ مسٹر ممتاز بھٹو کے درمیان ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں طے پایا کہ اس وقت جبکہ دریائے سندھ میں طغیانی آئی ہوئی ہے اور پانی کوٹری سے سمندر میں جا رہا ہے تو اس نہر میں پانی جاری کر دیا جائے۔

جس طرح کنفیڈریشن کے حامی ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور کی رٹ لگائے رکھتے ہیں اسی طرح سندھ کے سیاست دان اور اہلکار پانی کے سلسلے میں بار بار ۱۹۷۲ء کے اس معاہدے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چشمہ جہلم رابطہ نہر صرف اسی حالت میں جاری ہو سکتی ہے جب دریائے سندھ میں سیلاب آیا ہوا ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جولائی ۱۹۷۲ء کی

میٹنگ میں ایک ہنگامی صورتحال کا ایک ہنگامی حل ڈھونڈا گیا تھا جس کی کوئی قانونی یا انتظامی حیثیت نہ تھی۔ دوسرے چشمہ جہلم رابطہ نہر کا تعلق پنجاب اور سندھ کے درمیان پانی کی تقسیم سے ہے ہی نہیں۔ یہ تو پاکستان اور بھارت کے درمیان پانی کے تنازعہ کے اُس حل کا حصہ ہے جسے سندھ طاس کا معاہدہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال پنجاب کی بد قسمتی دیکھئے کہ حکومتِ پنجاب نے مرکزی حکومت سے اس اہم مسئلے کے کسی منصفانہ اور مستقل حل کیلئے سنجیدگی سے بات ہی نہ چلائی تھی۔ دو سال یونہی گذر گئے حالانکہ انہی دو سالوں میں اس مسئلے کا نہایت آسانی کے ساتھ کوئی قابلِ قبول اور قابلِ عمل حل نکل سکتا تھا اس وقت پنجاب اور سندھ کے دونوں صوبوں ہی میں نہیں مرکز میں بھی ایک ہی سیاسی جماعت ـ پاکستان پیپلز پارٹی ـ کی حکومت تھی۔ بھٹو صاحب کا تعلق سندھ سے تھا اور ان کی سیاسی ہردلعزیزی اور قوت کا مرکز پنجاب تھا۔ وہ تھوڑی سی اخلاقی جرأت سے کام لیتے تو دونوں صوبوں کی حکومتوں کو کسی منصفانہ حل پر راضی کرنا ان کیلئے ہرگز مشکل نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ سندھ میں ان کے چچازاد ممتاز بھٹو کی اور پنجاب میں ان کے دستِ راست غلام مصطفےٰ کھر کی حکومت تھی۔ بہرحال ۱۹۷۳ء میں دریائے سندھ میں طغیانی کے باوجود پنجاب نے نہر کھولنے کا باقاعدہ مطالبہ نہ کیا اور اب میری باری آئی۔

میں نے پہلی مرتبہ پنجاب کی طرف سے بھرپور اور مدلّل "مقدمہ" بنا کر مرکزی حکومت کے ساتھ پانی کا سوال اٹھایا۔ روزنامہ "نوائے وقت" نے اپنی ۳ جون ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں جناب عارف نظامی کا ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے.......... چشمہ جہلم لنک کینال کی بندش، تاریخی پس منظر میں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "۱۹۷۴ء کی خریف کی فصل کے لئے بھی چشمہ جہلم لنک کینال سے پانی مہیا نہیں ہو رہا تھا جس پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر محمد حنیف رامے نے وفاقی وزیر صوبائی رابطہ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ سے نہر کھولنے کے لئے تحریری طور پر درخواست کی جس پر ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں ماہ اپریل، مئی اور وسط جون تک نہر بند رکھنے کے بعد عبوری طور پر اسے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سال ۱۹۷۵ء میں بھی اس فارمولے کو برقرار رکھا گیا"۔

اگر پنجاب کی طرف سے چشمہ جہلم رابطہ نہر میں پانی جاری کرنے کی صرف "درخواست" ہی کی جاتی تو شاید میں مرکزی حکومت، سندھی وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو اور سندھی وفاقی

وزیر صوبائی رابطہ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کی نگاہوں میں زیادہ نہ کھٹکتا۔ اصل میں جب "درخواست" کے ساتھ دلیل اور دلیل کے ساتھ ثابت قدمی شامل ہو جائے تو درخواست محض درخواست نہیں رہا کرتی بلکہ مطالبہ بن جاتی ہے۔ میں نے درخواست نہیں کی تھی' میں نے واقعتاً مطالبہ کیا تھا کہ پنجاب کو دریائے سندھ کے پانی سے اس کا جائز حصہ ملنا چاہئے۔ اور میں نے یہ مطالبہ اپنے عہد میں ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ کیا۔

وہ کون سی حقیقتیں تھیں جنھوں نے مجھے یہ مطالبہ کرنے کا حوصلہ بخشا؟

اول...... دریائے سندھ صرف صوبہ سندھ کا نہیں بلکہ پورے پاکستان کا دریا ہے۔ یہ پندرہ سو میل لمبا دریا صرف پانچ سو میل تک صوبہ سندھ میں اور تقریباً ایک ہزار میل تک اس صوبے سے باہر بہتا ہے۔ سندھ میں داخل ہونے سے پہلے یہ دریا اٹک سے رحیم یار خان تک پنجاب کے سینے پر مچلتا ہے۔ اس دریا میں صوبہ سرحد اپنے دو دریاؤں...... کابل اور کرم...... کا پانی ڈالتا ہے۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں...... ستلج' بیاس' راوی' چناب اور جہلم...... کے پانی بھی تریموں' سدھنائی اور پنجند پر جمع ہوتے ہوتے بالآخر اس دریا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جب دریائے سندھ صوبہ سندھ میں داخل ہوتا ہے تو اس میں سرحد اور پنجاب کے سات دریاؤں کا پانی شامل ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر یہی دریا وہ واحد ذریعہ ہے جس سے بلوچستان کی قابلِ کاشت اراضی کو پانی میسر آ سکتا ہے۔ اور بلوچستان کا بھی حق ہے کہ وفاق پاکستان کے ایک رکن کے طور پر دریائے سندھ سے حصہ پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سندھ کا یہ عیاں اور نہاں دعویٰ کہ دریائے سندھ کے پانی پر صرف اس کا حق ہے محض اس مغالطے پر مبنی ہے کہ اس دریا کا نام سندھ ہے۔ میں نے ۲۹ مئی ۱۹۸۵ء کو روزنامہ "جنگ" میں پانی کے مسئلے پر شائع ہونیوالے مذاکرے میں تجویز پیش کی تھی اور یہاں میں اسے دہراتا ہوں کہ اس دریا کا کوئی نیا نام رکھ دیا جائے۔ اگر این ڈبلیو ایف پی' یا صوبہ سرحد کا نام اس کے پختون باشندوں کی نسبت سے پختونستان تجویز کیا جا سکتا ہے۔ تو پاکستان کے چاروں صوبوں کے مشترکہ مفادات کے اقرار کے طور پر دریائے سندھ کو "دریائے پاکستان" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کا انگریزی نام...... انڈس...... بھی اب اچھا خاصا مقبول ہو چکا ہے اور بآسانی اپنایا جا سکتا ہے۔ نہیں تو ایک نیا نام "پاکاب" ذہن میں آتا ہے جس کے اجزائے ترکیبی "پاک" اور "آب" ہیں اور ان میں سے "پاک" کا ایک مطلب پاکستان بھی ہے۔ یہ بڑا خوبصورت نام ہے لیکن اس کی وضع قطع اور ترکیب "پنجاب" سے بہت ملتی جلتی ہے اس لئے ہو

سکتا ہے کہ دوسرے صوبوں کے سیاستدانوں کو زیادہ پسند نہ آئے۔ چنانچہ میرا ووٹ "دریائے پاکستان" کے حق میں ہے۔ ضمناً عرض ہے کہ میں تو اب اپنے بزرگ دوست اے ڈی اظہر مرحوم کی رائے سے متفق ہوتا جارہا ہوں کہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی رابطہ زبان کو اردو کے بجائے اسی طرح "پاکستانی" کہنا چاہئے جیسے فرانس کی زبان کو فرانسیسی، جرمنی کی زبان کو جرمن، عرب کی زبان کو عربی اور روس کی زبان کو روسی کہا جاتا ہے۔ قصہ مختصر، دریائے سندھ پورے پاکستان کا دریا ہے اور اس کے چاروں صوبوں کو.......... پنجاب سمیت اس میں سے پانی ملنا چاہئے۔

دوم..... پاکستان کے پاس پانی کی کمی نہیں۔ یہ کمی مصنوعی اور موسمی ہے۔ اور اسے محنت اور توجہ سے دور کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تک دریائے سندھ سمیت پاکستان کے سارے دریاؤں کے پانی کا صرف آدھا حصہ کاشت یا آبپاشی کے کام آتا اور آدھا حصہ ضائع ہو جاتا یا سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس تمام پانی کو استعمال میں لا کر نہ صرف چاروں صوبوں کی حالیہ ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں بلکہ اس سے جگہ جگہ بجلی پیدا کر کے صنعتی ترقی کو بھی یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری حکومتیں باتیں زیادہ اور کام کم کرتی ہیں۔ اس کی وجہ سیدھی ہے۔ ہمارے ملک میں کام تو کمّی کرتے ہیں اور کمّی آج تک حکومت میں نہیں آئے۔ حکومت میں صرف جاگیردار آیا ہے۔ جس سے بڑا حرام دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یا پھر جرنیلوں نے حکومت کی ہے۔ اور جرنیل مارشل لاء کے ٹینکوں پر چڑھ کر آتے ہیں جو سامراج کا عطیہ ہوتے ہیں۔ جرنیلوں کے بس میں ہوتا ہی نہیں کہ وہ سامراجی طاقتوں کے مفادات سے الٹ چل سکیں۔ اور سامراج کبھی نہیں چاہتا کہ ہمارے جیسے ملک زراعت یا صنعت میں خود کفیل ہو جائیں۔ بظاہر سیاسی طور پر آزاد ہو جانے کے بعد ہم تیسری دنیا کے ممالک سامراج کے قائم کردہ جدید نو آبادیاتی نظام میں اس کی منڈیاں بن کر ہی جی سکتے ہیں تا آنکہ ہماری قوتِ انقلاب جوش مارے اور ہم ان جاگیرداروں اور جرنیلوں کو سیاست سے نکال باہر کریں جو روزِ اول سے رزقِ حلال کما کر کھانے والے محنت کش طبقوں کے سر پر مسلط چلے آتے ہیں۔

اگر پاکستان میں سیاست محنت کش کی ہو، قیادت محنت کش کی ہو، حکومت محنت کش کی ہو تو چند ہی سالوں میں چاروں صوبوں میں دریاؤں اور ندی نالوں کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ایسے آبی ذخیرے بنائے جاسکتے ہیں کہ بارشوں اور سیلابوں کے موسم میں بھرے ہوئے دریا اور ندی نالے ان ذخیروں کو بھر دیا کریں اور جب خشک موسم آجائے تو ان ذخیروں سے وافر پانی کاشت کاری کے

لئے دستیاب ہو جائے۔ تربیلا' منگلا اور چشمہ..... یہ تینوں مصنوعی جھلیں اسی اصول پر بنائی گئی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر ذخیرہ آب اتنا ہی بڑا ہو' چھوٹے بڑے ڈیموں' جھیلوں اور تالابوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ پورے ملک میں پھیلایا جاسکتا ہے تاکہ اس پانی کو لگام دی جاسکے جو برسات اور سیلاب کے دنوں میں بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے اور بالآخر سمندر میں جا گرتا ہے۔ یوں اس پانی کو بستیوں کی آبادی اور خوشحالی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے بہت زیادہ وسائل کی ضرورت ہوگی' بے تحاشا سرمایہ درکار ہو گا' بیرونی امداد چاہئے ہوگی' مگر میری دانست میں تھوڑا بہت روپیہ تو ضرور ہونا چاہئے البتہ جن کاموں میں عوام کا مفاد ہو وہ عوامی قوت سے بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ عوامی جمہوریہ چین میں چیئرمین ماؤزے تنگ کے دور میں ایسے کئی منصوبے مفت مکمل کر دیئے گئے۔ پاکستان میں بھی عوامی قوت کو انقلاب انگیز تعمیری اور پیداواری راہوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔ لاہور کی سرحد پر بی۔ آر۔ بی نہر کو اسی عوامی قوت نے وجود بخشا تھا۔

سوم...... صوبہ سندھ کا یہ خدشہ بے بنیاد ہے کہ اگر پنجاب کو اس کی آج کی ضروریات کے لئے پانی دے دیا گیا تو سندھ کی کل کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں گی۔ غور سے دیکھا جائے تو پانی کے مسئلے میں پنجاب اور سندھ کے درمیان سب سے اہم الجھن یہی ہے۔ سندھ کے اہلکار ۱۹۷۲ء کے ہنگامی اور عارضی تصفیے کے علاوہ ۱۹۴۵ء کے ایک معاہدے کا بھی اکثر ذکر کرتے ہیں حالانکہ ۱۹۴۵ء میں کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سال مرکزی حکومت نے پانی کی تقسیم کے سلسلے میں ایک مسودہ برائے منظوری (DRAFT) تیار کیا تھا جو کبھی منظور نہ ہو پایا کیونکہ حکومت پنجاب نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ڈرافٹ کو معاہدہ کہنا سراسر زیادتی ہے۔ اور اس کی کوئی قانونی یا انتظامی حیثیت نہیں۔ گو سندھ کی یہ فکر مندی بلا جواز نہیں کہ کل جب اس کی قابل کاشت لیکن فی الحال بیکار پڑی ہوئی زمینوں کے لئے نہری پانی چاہئے ہو گا تو وہ کہاں سے آئے گا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مستقبل کا استحقاق ثابت کرنے کے لئے مصنوعی طریقے اختیار کرے۔ مثلاً جب اس کے کھیتوں میں پانی کی گنجائش نہ رہے تو وہ محض استعمال کی شرح زیادہ دکھانے کے لئے پانی کچی سڑکوں' چراگاہوں اور شکار گاہوں میں ڈال کر اپنے لئے خوامخواہ سیم کا مسئلہ کھڑا کرلے۔

سندھ نے "استعمال" کو بڑھا چڑھا کر دکھانا شاید اس لئے شروع کیا ہے کہ جسٹس فضل اکبر

کمیٹی نے استعمال (USAGE) کو پانی کی تقسیم کی ایک اہم بنیاد قرار دیا تھا۔ گو سندھ نے ۱۹۷۱ء میں پیش ہونے والی اس رپورٹ کو ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس نے اندر ہی اندر استعمال کی شرح پہلے کی بہ نسبت تقریباً چالیس فیصد بڑھالی ہے تاکہ اگر مستقبل میں پانی کی تقسیم کے لئے "استعمال" ہی بنیاد ٹھہرے تو اس کا کیس مضبوط تر نظر آئے۔

سندھ کو یہ ڈر بھی ہے کہ آج پنجاب کی زمینوں کو ان کی ضرورت کا پانی دے دیا گیا تو کل جب سندھ میں نئی زمینیں زیر کاشت آئیں گی تو لازماً پنجاب کو شکایت ہوگی کہ اب اس کا پانی کیوں کم کیا جارہا ہے۔ یہ صحیح اور جائز سوچ ہے مگر سندھ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ پنجاب میں بھی انسان ہی بستے ہیں اور ان کے پاس بھی ایسی زمینیں ہیں جو قابل کاشت ہیں لیکن ابھی زیر کاشت نہیں آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منگلا اور چشمہ تو ان دریاؤں کے متبادل کے طور پر وجود میں آئے تھے جو سندھ طاس کے معاہدے کے مطابق بھارت کو تھمادیئے گئے۔ ان کا پانی تو اس کمی کو پورا کرنے کے لئے تھا جو سندھ طاس کے معاہدے سے پیدا ہوگئی تھی۔ البتہ یہ طے ہوا تھا کہ تربیلا کا پانی نئی زمینوں کو زیر کاشت لانے کے کام آئے گا اور اس میں سے سندھ کی طرح پنجاب کو بھی چولستان جیسے نئے منصوبوں کے لئے پانی ملے گا۔ مسٹر ایس ایس کرمانی جو آج کل ورلڈ بینک میں مشیر ہیں اور پہلے سندھ طاس کی نہروں کے چیف انجینئر تھے اس ضمن میں اتھارٹی گنے جاتے ہیں۔ ان کی تحقیق تھی کہ اس وقت پنجاب اور سندھ کو ایک لاکھ ۴۵ ہزار کیوسک پانی کی ضرورت ہے۔ اس وقت تربیلا سے ایک لاکھ چالیس ہزار کیوسک پانی ڈسچارج ہو رہا ہے۔ پنجاب خشک پڑا ہے ظاہر ہے کہ پانی صوبہ سندھ میں جارہا ہے، پھر آخر سندھ کی ضروریات کیسے پوری نہیں ہو رہیں۔ اگر اس کی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں تو ضرورت سے زائد پانی کے دباؤ سے اس کی نہریں کیوں ٹوٹ رہی ہیں ؟

چہارم...... سندھ کا یہ کہنا درست نہیں کہ دریائے سندھ سے پانی لینے کا پہلا حق اس کے ان منصوبوں کا ہے جو چشمہ جہلم رابطہ نہر سے پہلے بنے تھے مثلاً کوٹری اور گدو بیراج وغیرہ۔ سندھ یہ بھول جاتا ہے کہ چشمہ جہلم رابطہ نہر گو بعد میں بنی ہے مگر یہ رابطہ نہر ہے اور اس سے ان نہروں کو پانی دیا جارہا ہے جو سندھ کی نہروں سے بہت پہلے بنی تھیں اور جنہیں قبل ازیں ستلج، بیاس اور راوی سے پانی ملتا تھا۔ یاد رہے کہ سندھ میں ۱۹۳۰ء سے پہلے کوئی باقاعدہ نہر نہیں تھی۔ سکھر بیراج بھی ۱۹۳۲ء میں بنا۔ کوٹری ۱۹۴۹ء اور گدو ۱۹۶۰ء میں بنا ــــ اس کے برعکس پنجاب میں نہری نظام

۱۸۵۵ء سے بننا شروع ہو گیا تھا۔ ستلج ویلی پراجیکٹ بھی ۱۹۳۲/۳۳ء میں بن گیا تھا۔

پنجم...... سندھ کا یہ کہنا کہ چشمہ جہلم رابطہ نہر صرف اس وقت جاری ہونی چاہیے جب دریائے سندھ میں طغیانی آئی ہو اس وقت تک تو کچھ وزن رکھتی تھی جب تربیلا ڈیم نہیں بنا تھا۔ اس ڈیم کے بننے کے بعد تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار کیوسک مزید پانی مہیا ہو گیا ہے جو زیادہ تر صوبہ سندھ کے کام آ رہا ہے۔ میری وزارت اعلیٰ کے وقت بھی چشمہ جہلم رابطہ نہر کچھ روز کیلئے بند ہوتی تھی۔ لیکن ۱۹۷۶ء میں تربیلا جاری ہو جانے کے بعد اس بندش کا کوئی جواز نہیں رہا۔

پانی کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے ہمیں صوبائی ہی نہیں قومی نقطہ نظر سے بھی سوچنا چاہیے۔ پانی کی ضرورت صرف پنجاب اور سندھ ہی کو نہیں سرحد اور بلوچستان کو بھی ہے۔ چاہیے تو یہ کہ جب پانی کم ہو تو ہم "حق" کی سطح سے اتر کر صرف "ضرورت" کو معیار بنالیں۔ اگر ہمارا حق زیادہ بھی ہو تو ہمیں "قل العفو" کے مصداق ضرورت کا پانی رکھ کر باقی سب دوسروں کیلئے کھول دینا چاہیئے۔ میں یہ بات سندھ ہی سے نہیں پنجاب سے بھی کہہ رہا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سندھ مستقبل کی فکر میں مبتلا ہو کر آج پنجاب کو پیاسا مار دے اور اپنے آپ کو سیم کے پانی میں ڈبو لے۔ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے کی یہ روش صحت مندانہ نہیں۔

مرکزی حکومت کا بھی فرض ہے کہ صوبوں کے درمیان بیٹھ کر نہ صرف پانی کی موجودہ کمی کو سب کی ضروریات کے مطابق مساویانہ بانٹ دے بلکہ ضمانت دے کہ چاروں صوبوں کو ان کی آئندہ کی ضروریات اور ترقیاتی زرعی منصوبوں کیلئے پانی مہیا کیا جائے گا اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو اس کے وجود کا کوئی جواز نہیں اور اسے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔

دل کی بات زبان پر آ کر رہتی ہے۔ لوگ سرعام کہہ رہے ہیں کہ موجودہ غیر سیاسی حکومت نے پانی کے مسئلے پر جو بے حسی دکھائی ہے۔ اور جس طرح اسے طول دیا ہے کوئی کمزور سے کمزور سیاسی حکومت بھی ایسا کبھی نہ کرتی۔ ظاہر ہے کہ صدر ضیاء الحق کی حکومت نے ایسا کیا ہے تو اس میں اس کا کوئی مفاد ہونا چاہیئے جو اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ مارشل لاء جاری رکھنا چاہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کراچی کے فسادات، بجلی کی اندھا دھند لوڈشیڈنگ، شمال مغربی سرحد پر

دباؤ اور سب سے بڑھ کر پانی کے مسئلے کو اس بری طرح کیوں نظر انداز کیا جارہا ہے؟

جواب زیادہ مشکل نہیں البتہ بے حد خطرناک ہے۔

سامراجی طاقتوں نے اندازہ کر لیا ہے کہ پاکستان روس سے ٹکر لینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی اس کے ذریعے سے افغانستان میں "مجاہدین" کو ایسی موثر مدد دی جا سکتی ہے کہ وہ وہاں روس کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیں۔ اب ان طاقتوں کا ارادہ ہے کہ بھارت کو روس کے خلاف میدان میں لائیں اور پاکستان کو توڑ کر بھارت کو موقع دیں کہ طورخم پر اپنی فوجیں لا کھڑی کرے۔ جس روز ایسا ہو گیا امریکہ کی وساطت سے چین اور بھارت کی صلح کرا دی جائے گی اور ان دونوں کو روس کے خلاف صف آرا کر دیا جائے گا۔

میں نے گذشتہ بہت سے برس جہاں پنجاب کو صوبائی خود مختاری کا درس دینے میں صرف کئے ہیں وہاں یہ سارا عرصہ پاکستان کو سمجھاتا رہا ہوں کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی کا رخ درست کرے۔ ہماری بقاء امریکہ کا دم چھلا بننے میں نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ ہمیں روس کا دم چھلا بن جانا چاہئے۔ ہرگز نہیں۔ ہمیں جلد از جلد ان دونوں سپر طاقتوں کے وسط میں اپنا مقام بنانا ہو گا اور ہمسائیگی کے ناتے روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے ہوں گے۔

پانی کے مسئلے کو دوسرے مسائل سے الگ کر کے دیکھا گیا تو صرف صوبائیت اور بالآخر خانہ جنگی وجود میں آئے گی البتہ اسے پاکستان کی سلامتی اور اس کے چاروں صوبوں کے سارے عوام کی خوشحالی کے منظر و پس منظر میں سلجھانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی تو نہ صرف یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے گا بلکہ ایسی مثال پیدا ہو جائے گی کہ جس کی روشنی میں دوسرے قومی اور بین الصوبائی مسائل کا قابلِ قبول اور آبرومندانہ حل بھی نکل آئے گا۔

نیت ہو تو آج بھی پانی کے مسئلے کا موثر حل نکل سکتا ہے۔ چاروں صوبائی اسمبلیاں پانی کے سلسلے میں ایک ایک کمیٹی بنا دیں، ہر کمیٹی اپنے اپنے صوبے کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کا تعین کرے۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹوں پر سینیٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان پر مشتمل ایک مرکزی پارلیمانی کمیٹی میں غور ہو جائے۔ دوسری طرف ملک کی چودہ پندرہ سیاسی جماعتیں اپنی اپنی کمیٹیوں میں اس مسئلے پر غور کریں اور اپنے ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں آخری رائے قائم کر لیں۔ بالآخر مرکزی پارلیمانی کمیٹی اور اعلیٰ سطحی سیاسی کمیٹی آپس میں مل بیٹھ کر کسی اتفاق رائے (CONSENSUS) پر پہنچ جائیں۔

اگر یہ کام مشکل یا محال نظر آتا ہو تو پھر تھوڑا انتظار کیا جائے اور مارشل لاء کے خاتمے کے بعد جو بھی سیاسی نظام آئے یہ مسئلہ اس کے ذمے لگا دیا جائے۔ یہ مسئلہ اس نظام کا امتحان ہو گا۔ اگر اس نظام نے اس کا حل نکال لیا تو وہ کامیاب ٹھہرے گا' نہیں تو وقت کی آندھیاں اسے بہا کر لے جائیں گی۔ بس دعا اور کوشش کرنی چاہئے کہ ان آندھیوں میں پاکستان سلامت رہے اور اس کے بے قصور عوام جاگیرداروں اور جرنیلوں کے جبر سے چھٹ کر بنیئے کی غلامی میں نہ جا گریں۔

آخر میں چند الفاظ سندھ طاس معاہدے کے بارے میں:

بھارت کے ساتھ سب سے پہلے پانی کا تنازعہ اپریل ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا جب اس نے ستلج' بیاس اور راوی کا پانی روک لیا۔ اس موقع پر پاک پنجاب کی طرف سے میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات نے بھارتی حکام سے مذاکرات کئے۔ ایک طرح سے بعد میں درپیش آنے والی ساری خرابی کی بنیاد انہی مذاکرات میں رکھ دی گئی تھی۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں' طے پایا کہ بھارت ستلج بیاس اور راوی کا پانی اپنے علاقے میں واقع ڈیموں کے ذریعے نہ روکے گا مگر پاکستان اس پانی کے عوض بھارت کو معاوضہ ادا کر دے گا۔ پاکستان نے کچھ عرصہ یہ معاوضہ ادا بھی کیا۔ اس طرح بالواسطہ طور پر ان دریاؤں کے پانی پر بھارت کا حق تسلیم کر لیا گیا جسے بعد میں سندھ طاس کے معاہدے میں حتمی شکل دے دی گئی۔ اسی طرح جب سندھ طاس کے معاہدے کے مطابق یہ طے پایا کہ بھارت کو ان تینوں دریاؤں کے پانی پر تصرف حاصل ہو گا تو بالواسطہ طور پر یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ سرزمین کشمیر پر بھارت ہی کا تصرف رہے گا کہ جو ان دریاؤں کی گزر گاہ اور منبع ہے۔ بلکہ جب منگلا ڈیم پنجاب کے بجائے آزاد کشمیر میں بنایا گیا تو ایک طرح سے کشمیر کی تقسیم پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔

سامراجی قوتوں کے دباؤ تلے اور ایوبی مارشل لاء کے دور میں طے پانے والا سندھ طاس کا بین الاقوامی معاہدہ نہ صرف پنجاب کو اس کے تین دریاؤں سے محروم کر گیا بلکہ اس نے کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کے موقف اور مفاد کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ایک طرف پاکستان نے کشمیر کی خاطر دو جنگیں لڑیں اور دوسری طرف یہ معاہدہ کر کے کشمیر کی تقسیم کو عملاً تسلیم کر لیا۔ اب اس معاہدے پر پاکستان کے اندر پنجاب اور سندھ میں بدمزگی اور تلخی پیدا ہو رہی ہے اور ساتھ ہی سرحد اور بلوچستان محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مفادات بھی محفوظ نہیں۔ اوپر سے مرکزی حکومت بھی نشانۂ تنقید بن رہی ہے۔ یہ ساری صورتحال اس معاہدے کے غلط اور غیر تسلی بخش ہونے کی

دلالت کرتی ہے۔

کیا وقت نہیں آ گیا کہ پاکستان اس غیر منصفانہ معاہدے کو کالعدم قرار دے کر مسترد کر دے اور اپنے دریاؤں کی واپسی کا مطالبہ کر دے؟

اور اگر ہماری مرکزی حکومت میں یہ کچھ کر گذرنے کی ہمت نہیں تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس معاہدے پر پاکستان کے اندر دیانت داری سے عمل کرتے ہوئے سندھ، سرحد اور بلوچستان کی طرح پنجاب کو بھی اس کے حصے اور ضرورت کا پانی بخوشی دے دیا جائے؟

گیارھواں باب

عبدالغفار خان اور ولی خان سے سوال و جواب

کالاباغ ڈیم

مضمون...... خان عبدالغفار خان

روزنامہ جنگ (۲۱ جون کے شمارے) میں وفاقی وزیر منصوبہ بندی جناب ڈاکٹر محبوب الحق کا انٹرویو پڑھا۔ اس میں اکثروہی پرانی باتیں دہرائی گئی ہیں جس کا مناسب اور معقول جواب وقتاً فوقتاً میں دیتا رہا۔ معلوم نہیں کہ پرانی باتوں کی رٹ لگانے سے یہ وزرائے کرام کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ " کالاباغ ڈیم پر تیس برس تک کام ہوا ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ منصوبہ قوم کے سامنے کب پیش کیا گیا تاکہ اس کے مفید اور مضر اثرات پر قومی سطح پر بحث کی جاسکے۔ یہ بد بختی رہی ہے کہ یہاں عوام کی حاکمیت اور ان کی مرضی کو کبھی بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ حکومتیں بھی صرف اور صرف محلاتی سازشوں کے ذریعے سے وجود میں آئیں۔ اور اس بات کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی گئی کہ یہ ملک ایک جمہوری عمل کے ذریعے سے معرض وجود میں آیا ہے اور اس کی وحدت اور سالمیت بھی صرف اور صرف عوام کی مرضی اور جمہوری عمل سے قائم رہ گئی ہے۔ اسی طرح کالاباغ کا منصوبہ بھی حکومتی فائلوں میں محبوس رہا اور قوم کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ اور جب پچھلے سال یہ منصوبہ ان خفیہ محلاتی تہہ خانوں سے نکالا گیا تو پورے ملک کو عموماً اور صوبہ سرحد کو خصوصاً اس کے مضر اثرات کا احساس ہوا اور ایک مسئلے کی حیثیت سے اس کے سارے پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ وزیر موصوف خود اعتراف کرتے ہیں کہ اس کی منصوبہ بندی میں کچھ غلطیاں تھیں اور اس لئے اب اس کی اونچائی کو کم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ یعنی یہ بات وزیر صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ جس منصوبے پر محلاتی فائلوں میں ماہرین نے تیس سال کام کیا اس میں چند بنیادی خامیاں تھیں۔ جب قوم نے ان کی

نشاندہی کر دی' تبھی توڈیزائن کی تبدیلی کی نوبت آئی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ون یونٹ کے تباہ کن اثرات کو زائل کرنے کے لئے اب جو خصوصیت سے چھوٹے صوبوں کے عوام اپنے حق کو اپنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اس قومی مطالبے کی نزاکت کا احساس ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کو بھی ہوا اور جب مرکز با امر مجبوری اختیارات صوبوں کو منتقل کرے گا تو اب پنجاب کے جاگیردار' سرمایہ دار اور نوکر شاہی کو احساس ہوا کہ چھوٹے صوبوں کو ان کے وسائل لوٹانے کے بعد پنجاب کو کن مشکلات کا سامنا ہو گا۔ آج یہ احساس پنجاب کے ترجمان کو شدت سے ہو رہا ہے کہ پنجاب نے اپنا پانی ہندوستان کو بیچ کر کتنی مصیبت اپنے لئے لے رکھی ہے۔ ایک تو ان کے پاس اپنا ایک دریا بھی نہ رہا جس پر پن بجلی لگا سکیں۔ پانی کی تقسیم کا مسئلہ پنجاب کی تقسیم کے سلسلے میں اٹھا مگر پنجاب نے از خود یہ پانی ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ اور پنجاب کے دریاؤں کی تقسیم میں دریائے سندھ کو بھی شامل کر دیا جو کسی طریقے سے بھی ہندوستان اور پنجاب کی ملکیت نہیں تھی۔ اب محبوب الحق صاحب کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ ان کے پیشروؤں نے اپنا پانی بیچ کر پنجاب اور پاکستان کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔ آج یہ حضرت جو اعداد و شمار پیش کر رہے ہیں اور پن بجلی' تھرمل بجلی اور تیل سے پیدا کرنے والی بجلی کے نفع و نقصان سے قوم کو آگاہ کیا جا رہا ہے تو یہ اعداد و شمار اس وقت ان حاکمان وقت اور مشیران کرام اور ماہرین عظام کے ذہن میں کیوں نہیں آئے۔ محبوب الحق کا کیا ارادہ ہے کہ اس بد دیانتی اور قومی مفاد کے حصول کی کوتاہی کو اب ہمارے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور چونکہ پنجاب کے حاکموں نے قومی خیانت کر کے اپنا پانی ہندوستان کے حوالے کر دیا تو اس جرم کی سزا اب صوبہ سرحد کو مل رہی ہے کہ ہمارا اپنا دریا ہم سے چھین لیا جائے اور ہمارے اپنے دریا پر بند باندھ کر ہمیں اس میں ڈبو دیا جائے۔ کوئی خود دار قوم اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔

ملک کے وہ حکمران جن کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوتا تو وہ ملکی حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھ کر ملکی حالات اور مشکلات کا احساس کم ہی کر سکتے ہیں۔ اور پھر یہ ماہرین جن کی نوکری کا بیشتر وقت غیر ملکی دوروں میں صرف ہوتا ہے اور ان کی نظریں اپنی فائلوں اور دفتروں سے باہر نہیں جھانکتیں یہی کچھ ہمارا یہ وزیر منصوبہ بندی کرتا آیا ہے۔ اس کے مفصل بیان سے یہ بات یقیناً واضح ہو جاتی ہے کہ وزیر صاحب کی منصوبہ بندی صرف کاغذ اور فائل تک محدود ہے۔ فرماتے ہیں کہ "مردان کے وہ علاقے جو پہلے متاثر ہو چکے ہیں ان کے لئے خصوصی پروگرام شروع کئے جائیں تاکہ وہ بحال ہو کر زرخیزی دیں"۔ کچھ سوچیں تو تسلیم کرتے ہیں کہ مردان اور صوابی کے علاقے متاثر ہو چکے ہیں۔ اور اس کے لئے سکارپ کے ذریعے کروڑوں اربوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے کہ سیم اور تھور سے متاثرہ زمینوں کو دوبارہ کاشت کے قابل بنایا جا سکے۔ یعنی یہ علاقے موجودہ حالت میں بھی سیم

تھور سے متاثر ہیں تو کیا ہم اس ماہر سے پوچھ سکتے ہیں کہ جب آپ کالاباغ بند باندھ لیں گے اور دریا کی سطح کو تقریباً ایک ہزار فٹ اونچا کر دیں گے تو اس کے نتیجے میں یہ علاقے زیادہ خشک ہو جائیں گے؟ آج تو سکارپ کے ذریعے سیم اور تھور کے سلسلے میں زیر زمین پانی کو دریاؤں میں ڈال کر زمین کو دوبارہ قابل کاشت بنایا جا رہا ہے تو کل کو یہ زیر زمین پانی آپ کہاں نکالیں گے۔ عربی میں کہتے ہیں کہ غرض کا بندہ مجنون ہوتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ پہلے صوبہ سرحد سے اس کی مخالفت کی گئی پھر سندھ اور بلوچستان نے اس کی مخالفت کی۔ آخر میں پنجاب سے بھی اس قسم کے کچھ اعتراض سنائی دیئے کہ پنجاب کا بھی نقصان ہو گا اور آگے جا کر خود فرماتے ہیں کہ یہ دنیا کا عجیب و غریب منصوبہ ہو گا جس سے بیک وقت چاروں صوبوں کو نقصان ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ "اس کے جواب میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اب ماہرین نے تیس سال تک ایک ایسے منصوبے پر لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کیا جس کی مخالفت ملک کے چاروں صوبے کر رہے ہیں سوال اٹھتا ہے کہ اگر ملک کے چاروں صوبوں سے ایک منصوبے پر اعتراض کیا جاتا ہے تو پھر وہ کونسی قوت ہے جو اس ملکی اعتراض کے باوجود بھی اس منصوبے کو آگے لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ابھی تک تو یہ اعتراضات اور جوابات کاغذی سطح تک محدود رہے اور اخباری بیانات تک بحث و مباحثہ جاری رہا۔ مگر اب تو پنجاب سے اس قسم کی آوازیں آ رہی ہیں کہ پچاس ہزار افراد کو کالاباغ بند کے منصوبے کے دفاع کے لئے منظم کیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ اب یہ مسئلہ افہام و تفہیم کی حدود کو پھلانگ کر محاذ آرائی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ اور بین الصوبائی شکوک و شبہات سے نکل کر ایک دوسرے کی دیانت داری اور حب الوطنی کو چیلنج کر دیا جاتا ہے۔ اور اب تو بالکل ننگی جارحیت کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پنجاب کے جاگیردار' سرمایہ دار' نوکر شاہی اور بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر ناچنے والوں کا کالاباغ کا منصوبہ خانہ جنگی کے منصوبے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس طریقے سے پشتونوں' سندھیوں' بلوچوں اور پنجابیوں کو آپس میں لڑوا کر معلوم نہیں کس منصوبہ کی تکمیل کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ اب اگر اس جنگجویانہ ذہنیت کو ملک کے اندرونی اختلافات کے ساتھ ساتھ ملک کی سرحدات پر حالات کے ساتھ ساتھ غور سے دیکھا جائے تو بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ اس طریقے سے اس ملک کی سالمیت اور وحدت کو ایک بار پھر داؤ پر لگایا جا رہا ہے اور ویسے ہی حالات پیدا کئے جا رہے ہیں جس طرح مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کرنے کے لئے کئے جا رہے تھے۔

ایک بات جو میری سمجھ سے باہر ہے وہ ہے وزیر موصوف کا یہ مشورہ کہ "تمام صوبے اور ان کی سیاسی جماعتیں اسے سیاسی مسئلہ نہ بنائیں اور مستقبل میں دیکھنے کی کوشش کریں" سیاست اور سیاسی پارٹیوں سے نفرت ایک مارشل لائی حکومت کی خصوصیت ہوتی ہے اور پھر نوکر شاہی کا مزاج ہی کچھ

ایسا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی فرد یا ادارے کو یہ حق نہیں دیتی کہ اس کے فیصلوں پر نکتہ چینی کرے۔ وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھ کر قوم سے یہ توقع رکھتی ہے کہ اس کے احکامات کی تعمیل بلا چون وچرا کرے اور یہ مرض سب سے بڑھ کر مارشل لاء کے دوران زور پکڑ گیا کہ پارٹیوں اور سیاست دانوں کی کردار کشی کر کے قومی ذہن کو سیاست سے متنفر کیا جائے۔ حالانکہ مہذب اور بالغ سوسائٹیوں میں قومی فیصلے قومی اور ملکی سطح پر سیاسی پارٹیوں کے ذریعے سے ہوا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ 'ملک پر حکمرانی کا حق بھی سیاسی پارٹیوں کو پہنچتا ہے۔ مگر ہماری بدبختی کہ اس ملک میں آج تک ہم یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے کہ ملک پر حکمرانی کا حق اس ملک کے عوام کا ہے یا نوکر شاہی کا۔ اور طریقہ کار جمہوری عمل ہوگا یا محلاتی سازشیں اور فوجی کودیتا۔ اور اب تو ایک مجرب نسخہ حکومت وقت اور ان کے حواریوں کو ملا ہے کہ اسلام 'اسلام کی رٹ لگا کر ضد اسلام حرکتوں اور پالیسیوں سے اپنے اقتدار کو دوام دیں۔ اور عوام کی حاکمیت کو بیچ سے نکال باہر کر کے فوجی اور سول نوکر شاہی اپنے ساتھ استحصالی قوتوں کو اکٹھا کر کے سامراجی طاقتوں کے مفادات کا تحفظ کرے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی پارٹیاں ان استحصالی اور عوام دشمن طاقتوں کے لئے زہر قاتل ہیں تبھی تو منصوبہ بندی کے وزیر صاحب کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ ملک سے سیاسی پارٹیوں کو ختم کرنے کے لئے بھی منصوبہ بندی کی جائے تاکہ عوام اور ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والوں کا راستہ روک دیا جائے۔ نوکر شاہی ملکی معاملات میں خود سری تب کر سکتی ہے جب کہ اسے ایک غیر تجربہ کار حکومت ملے اور اس سے بھی بہتر صورت یہ کہ ایسی حکومت برسر اقتدار رہے جو عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ اس لئے اسے فوجی حاکموں سے زیادہ موزوں اور کوئی صورت منظور نہیں ہوتی جب فوج اپنی بنیادی ملکی دفاعی ضروریات کو خیرباد کہہ کر ملک پر حکمرانی کا سوچ لے تو نوکر شاہی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور محلاتی سازشوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ سیاست شجر ممنوعہ اور سیاسی کارکن گردن زدنی کے قابل ہو جاتے ہیں۔

وزیر موصوف نے کافی وعدے کئے ہیں' یقین دہانیاں کرائی ہیں' گارنٹی اور ضمانت کی بات کی ہے مگر جس ملک میں شروع ہی سے حکمرانوں نے من مانی کارروائیاں کرا کر عوام کے حق کو غصب کیا اور جس قوم کو مغربی پاکستان کے ون یونٹ بنانے کے وقت وہ تمام سبز باغ یاد ہیں کہ کس طرح ایک منصوبے کے تحت مشرقی پاکستان کی اکثریت کو ختم کر کے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کا استحصال کیا گیا اور کس طرح ۱۹۷۰ء کے انتخابات کروا کر ان کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا اور کس طرح ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہنگامی حالات کی نذر کر دیا گیا' تو جس ملک میں آئین کے تقدس کو بھی اس بے تکلفی سے پامال کیا جاتا ہے اس ملک میں صرف اور صرف ایک احمق ہی سرکاری اہل کاروں اور حکومتی میمبروں کے وعدوں پر یقین کر سکتا ہے۔ چونکہ بحث دریا کے پانی کی ہے تو کیا میں محبوب الحق صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ تربیلا بند کی تعمیر سے پہلے ہمارے مردان ضلع کا کافی علاقہ

دریائے سندھ پر پینہور نہر سے سیراب ہوتا تھا۔ چونکہ بند نہر کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا تو پینہور نہر میں پانی آنا بند ہو گیا۔ متبادل صورت میں پہلے کے منصوبے میں ایک نہر دائیں کنارے رکھی گئی تھی جس کے لئے ایک سرنگ نکلوائی تھی۔ اس سرنگ پر کام بھی ہوا تو کیا وزیر منصوبہ بندی صاحب بتانا چاہیں گے کہ وہ سرنگ مکمل کر لی گئی کہ نہیں۔ اور اگر نہیں مکمل کر لی گئی تو کیا وزیر صاحب بتائیں گے کہ ہمیں اپنے دریائے سندھ سے اپنی ہی نہر پینہور سے پانی بند وا کر اس علاقے کو پانی سے محروم کیا گیا اس کی کیا وجوہات ہیں۔
اس طرح کی مثال ڈیرہ اسماعیل خان کی بھی ہے جہاں پر ہمیں چشمہ رائٹ بینک کینال کے لئے کوئی دس ہزار سات سو کیوبک پانی اگر مل جائے تو تقریباً گیارہ لاکھ ایکٹر رقبہ زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ حکومت سرحد نے کوشش کی اور مرکزی حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دریائے سندھ کے پانی کے فیصلے اور تقسیم کو چھیڑے بغیر ہم اپنے کابل (یا لنڈے) دریا کا پانی اپنے ساحل کے ساتھ لے جا کر اس مذکورہ پانی کو ڈیرہ اسماعیل خان کے چشمہ بیراج کے ذریعے لے لیتے اور باقی ۲۰ ' ۳۰ ہزار کیوسک اپنا پانی سندھ کے پانی میں چھوڑ دیتے ہیں تو کیا حکومت پاکستان نے یہ تجویز منظور کر دی۔ اب بھی ہمیں ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے آپ کے منصوبے پر صرف ڈھائی ہزار کیوسک پانی ملے گا جس میں پہلے سے ہمیں ۸۰۰ کیوسک پانی پہاڑ پور نہر کے ذریعے ملتا رہا۔ مطلب یہ کہ ہمیں صرف ساڑھے سترہ سو کیوسک پانی دستیاب ہو گا۔ تو کیا وزیر صاحب یہ بتانے کی زحمت اٹھائیں گے کہ آپ واقعی صوبہ سرحد کو پاکستان کا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہاں کی آبادی اور تعمیر کو پاکستان کی آبادی اور تعمیر ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال اور بھی ذہن میں آتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کالا باغ بند کی تعمیر سے چشمہ رائٹ بینک کینال کا حشر بھی پینہور نہر کی طرح ہو گا کہ وہ جو تھوڑا بہت پانی ملتا ہے وہ بھی بند کرا دیا جائے۔
پچھلے ۳۹ سال کی مسلسل استحصالی پالیسیوں کے نتیجے میں آج پاکستان ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ پنجاب کے جاگیردار ' سرمایہ دار اور نوکر شاہی نے ملی بھگت کر کے اس ملک کے عوام کو اپنے بنیادی ' آئینی ' انسانی ' جمہوری ' قانونی ' اقتصادی ' معاشی اور معاشرتی حقوق سے محروم رکھا اور اس کے نتیجے میں جناح صاحب کے پاکستان کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ باقی ماندہ پاکستان وہ پاکستان نہیں رہا جس کی بنیاد چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو رکھی گئی تھی اور جس کی اکثریت کو ان استحصالی قوتوں نے زبردستی کاٹ کے جدا کر دیا۔ اس لئے میں اس پاکستان کو جناح صاحب کا پاکستان تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس پورے مسئلے کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان حکمرانوں نے اس پوری تباہی سے بھی کچھ سبق نہیں سیکھا اور باقی ماندہ پاکستان میں بھی وہی ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ واضح ہے کہ گذشتہ سالوں کے تلخ تجربات کی روشنی میں اب چھوٹے صوبے پنجاب کی بالادستی قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔
اب ضرورت ہے کہ پنجاب کے یہ جاگیردار ' سرمایہ دار اور نوکر شاہی اپنی استحصالی پالیسیوں کو یکسر چھوڑ

کر ایک نئے پاکستان کے قیام کے لئے منصوبہ بندی کریں۔ یہ پرانے ہتھکنڈے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ قوم ان سے اب دھوکہ نہیں کھائے گی۔ جیسے میں نے کہا کہ ہم اس پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے البتہ ہم آپ کے ساتھ اس مسئلے پر تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ایک ایسا پاکستان بنائیں جس پر تمام قومیتوں کو ان کے جائز حقوق دیئے جائیں اور ان کی یہ تسلی کرائی جائے کہ اس نئے پاکستان میں آپ برابر کے حق دار ہیں اور اس پر حکمرانی میں اور اس کی دولت میں سب برابر کے شریک ہیں مختصراً ہم باعزت طریقے سے آپ کے ساتھ رہنے کے لئے تیار ہیں مگر غلامی ہم نے انگریز کی قبول نہیں کی تو پنجاب کی غلامی قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خان عبدالغفار خان کے نام کھلا خط

از محمد حنیف رامے

لاہور

۳ جولائی ۱۹۸۶ء

محترم خان عبدالغفار خان صاحب

سلام ورحمت!

کالاباغ ڈیم کے حوالے سے آپ کا جو مضمون یکم جولائی ۱۹۸۶ء کے روزنامہ جنگ میں شائع ہوا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا نہایت سنجیدگی سے نوٹس لینا ضروری ہے۔ آپ نے اس مضمون میں اگرچہ وہ تشدّد آمیز زبان استعمال نہیں کی جو آپ کے صاحب زادے محترم ولی خان نے کی تھی۔ جب انہوں نے کالاباغ ڈیم کو بم سے اڑا دینے کا اعلان کیا تھا۔ البتہ آپ کا پورا مضمون پنجاب کے ناکردہ گناہوں کی مذمت اور اہل پنجاب کے خلاف نفرت سے اٹا پڑا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس مضمون میں آپ نے دو سوال ایسے بھی اٹھائے ہیں جو نہ صرف درست بلکہ قابل تعریف ہیں۔ اول آپ نے اعتراض کیا ہے کہ اگر کالاباغ ڈیم کے منصوبے پر گذشتہ تیس سال سے کام ہو رہا تھا تو اسے قوم کے سامنے کیوں نہ رکھا گیا تاکہ اس کے اچھے برے پہلوؤں پر بحث ہو سکتی۔ واقعی ایسا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس میں پنجابیوں کا کیا قصور ہے؟ پنجابیوں نے تو پاکستان کی تقریباً چالیس سالہ تاریخ میں حکومت ہی صرف دو سال کی ہے۔ پھر جس ادارے (واپڈا) کے سپرد یہ کام تھا اس پر کل تک تو صرف پٹھان نوکر شاہی فائز رہی ہے۔ دوم آپ نے پوچھا ہے کہ اس ملک پر حکمرانی کا حق کیا اس ملک کے

عوام کا ہے یا نوکر شاہی کا' اور طریقۂ کار جمہوری ہو گا یا محلاتی سازشیں اور فوجی تسلط؟ بالکل درست۔ حکمرانی کا حق صرف عوام کو ہے اور طریقۂ کار بھی جمہوری ہی ہونا چاہئے' لیکن کیا محلاتی سازشیں صرف پنجابیوں نے کی ہیں اور ان میں پٹھان شامل نہیں تھے؟ اسی طرح کیا مارشل لاء پنجاب کے باسیوں نے لگائے تھے' کیا اس کے برعکس مارشل لاء نافذ کرنے والے تینوں جرنیل ایوب خان' یحییٰ خان اور ضیاءالحق صوبہ سرحد کے باسی نہیں؟

خان صاحب! آپ کے دونوں سوال اگرچہ درست ہیں مگر ان کے حوالے سے آپ نے پنجاب کے خلاف جس تعصّب کا اظہار کیا ہے وہ نہ صرف بلاجواز بلکہ افسوس ناک ہے۔ آپ سرحدی گاندھی کہلاتے ہیں۔ گاندھی جی کو ماننے والے (میں جاننے والوں کی بات نہیں کر رہا) انہیں تعصّب سے پاک بتاتے تھے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے پنجاب کے خلاف تعصب کی جو عینک ایک مرتبہ لگالی ہے' نمبر بدل جانے کے باوجود' آپ اسے اتارنے پر تیار نہیں۔

میں نے اس صورت حال پر بہت غور کیا ہے۔ یقیناً آپ میں مذہبی تعصّب نہیں بلکہ بعض اوقات تو آپ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں مگر آپ صوبائی تعصب سے کیوں نجات نہ پا سکے؟ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تاریخ کی نفسیات واقعی اپنے اندر بڑی تاثیر اور کشش رکھتی ہے۔ آپ نے دراصل پنجاب کے خلاف دو تاریخی کامپلیکس (الجھاو) پال رکھے ہیں۔ اگرچہ آپ ان کے متعلق بات نہیں کرتے لیکن آپ کی ہربات سے یہ الجھاؤ اس طرح ٹپکے پڑتے ہیں جیسے چوٹ کھائے ہوئے دل سے آنسو۔ آپ کا پہلا الجھاؤ یہ ہے کہ سکھوں کے دور میں پنجاب نے پورے صوبہ سرحد پر قبضہ کر کے یہاں حکمرانی کیوں کی۔ اب اس میں آج کے پنجاب کی مسلمان اکثریت کا کیا قصور ہے؟ بہتر یہ تھا کہ آپ یہ گناہ تاریخ کے سر ڈال کر ہمیں معاف کر دیتے مگر آپ ایسا نہیں کر سکے۔ آپ کو اس کا بہت درد ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ ہم نے انگریزی غلامی قبول نہیں کی تو پنجاب کی غلامی کیوں کر قبول کر سکتے ہیں' تو آپ کا یہ درد کھل کر سامنے آجاتا ہے کیونکہ تاریخ کے اوراق میں آپ نے ان دونوں غلامیوں کا تلخ مزہ چکھ رکھا ہے۔ اسی طرح جب آپ پنجاب سے میانوالی اور اٹک کے دوضلعوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس وقت بھی آپ تاریخ کی اسی درد انگیز چوٹ کو سہلا رہے ہوتے ہیں۔

آپ کا دوسرا الجھاؤ یہ ہے کہ پٹھانوں کے لیڈر تو آپ تھے مگر انہوں نے قیام پاکستان کے وقت قائداعظمؒ کا ساتھ کیوں دیا؟ اسی الجھاؤ کا ایک حصہ یہ ہے کہ جب کشمیر میں شیخ عبداللہ اور صوبہ سرحد میں آپ اور آپ کے بھائی کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے تو پنجاب نے بھی یہی رویّہ کیوں نہ اپنایا۔ اگر پنجاب آپ کا ساتھ دے دیتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔ اس الجھاؤ کی تہہ میں جو شکوہ کارفرما ہے وہ بے جا ہے۔ شکوہ تو پاکستان کے دوسرے مسلمانوں کو آپ سے ہونا چاہئے تھا کہ ان کی قومی جدوجہد میں آپ نے

ان کا ساتھ نہ دیا۔ آپ کو اگر شکوہ ہو سکتا تھا تو ولبھ بھائی پٹیل اور جواہر لال نہرو جیسے کانگریسی دوستوں سے ہونا چاہئے تھا۔ جنھوں نے آپ کو بے یارومددگار چھوڑ دیا اور پاکستان کے قیام اور وجود کو بادل ناخواستہ ہی سہی وقتی طور پر تسلیم کر لیا۔ آپ ان حضرات پر تو غصہ نکال نہ سکے البتہ اس غصے نے پنجاب اور اس کے عوام کے خلاف رخ کر لیا۔

آپ کے مضمون کا سب سے اہم لیکن قابلِ اعتراض حصہ وہ ہے جس میں آپ نے کہا ہے

> " آج یہ احساس پنجاب کے ترجمان کو شدّت سے ہو رہا ہے کہ پنجاب نے اپنا پانی ہندوستان کو بیچ کر کتنی مصیبت اپنے لئے لے رکھی ہے۔ ایک تو ان کے پاس اپنا ایک دریا بھی نہ رہا جس پر پن بجلی لگا سکیں۔ پانی کی تقسیم کا مسئلہ پنجاب کی تقسیم کے سلسلے میں اٹھا مگر پنجاب نے از خود یہ پانی ہندوستان کے حوالے کر دیا اور پنجاب کے دریاؤں کی تقسیم میں دریائے سندھ کو بھی شامل کر لیا جو کسی طریقے سے بھی ہندوستان اور پنجاب کی ملکیت نہیں تھی۔ "

آپ دبے لفظوں میں یہ تو مانتے ہیں کہ جب پنجاب کے دریا ہندوستان کے حوالے ہو گئے تو پنجاب کے لئے پانی کا مسئلہ پیدا ہو گیا مگر آپ یہ دریا ہندوستان کے حوالے کرنے کا الزام پنجاب ہی کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کہتے ہیں کہ " پنجاب کے حاکموں نے قومی خیانت کر کے اپنا پانی ہندوستان کے حوالے کر دیا مگر اس جرم کی سزا صوبہ سرحد کو مل رہی ہے کہ ہمارے اپنے دریا (سندھ) پر بند (کالاباغ ڈیم) باندھ کر ہمیں اس میں ڈبو دیا جائے۔"

پنجاب کے کچھ سادہ دل اکابر آپ کے ارشادات کو یہ کہہ کر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ آپ سترے بہترے ہو چکے ہیں لہٰذا آپ کی کسی بات کا برا نہ مانا جائے۔ حقیقت یہ نہیں۔ آپ کی عمر ہو سکتا ہے اب بھی سو سال کی ہو اور خدا کرے آپ مزید سو سال جئیں، لیکن آپ ماشاءاللہ ان معنوں میں عمر رسیدہ ہرگز نہیں کہ اپنے مطلب کی بات سے پھر جائیں اور مذمت اور نفرت کا رخ بدل دیں۔ آپ کے مضمون کا لفظ لفظ بتاتا ہے کہ آپ اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور پنجاب کو کوسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مگر پھر بھی آپ جیسے ہوشمند اور جہاں دیدہ سیاستدان کے بارے میں یہ سوچنا محال ہے کہ وہ تعصب میں اتنا دور نکل جائے گا کہ حالیہ تاریخ کی کھلی اور واضح حقیقتوں سے بھی آنکھ بند کر لے گا۔

خان صاحب! ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے، کیا یہ سچ نہیں کہ پنجاب کے دریاؤں کو ہندوستان کے حوالے پنجابی حکمرانوں نے نہیں بلکہ پٹھان حکمران ایوب خان نے کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان کے آنے اور ان سے پہلے پنجابی وزیر اعظم فیروز خان نون کے جانے کا باعث ہی یہ تھا کہ امریکی دباؤ کے باوجود پنجابی وزیر اعظم دریاؤں کا سودا کرنے پر تیار نہ ہوا۔ چنانچہ مارشل لاء لگوا کر پہلا بڑا کام ہی یہ کیا گیا

کہ ایوب خان کے ہاتھوں پنجاب کے تین دریا بھارت کے حوالے کر دیئے گئے۔ مجھے آپ سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ آپ یہ دعویٰ کس بنیاد پر کرتے ہیں کہ سندھ آپ کا دریا ہے اور پنجاب کا دریا نہیں؟ اٹک سے رحیم یار خان تک یہ دریا پنجاب کے سینے پر بہتا ہے۔ یہ جس طرح صوبہ سرحد اور سندھ کا دریا ہے اسی طرح پنجاب کا بھی ہے۔ آپ اس کے بلا شرکت غیرے مالک کیسے بن بیٹھے ہیں؟

یہ اہل پنجاب کی غلطی ہے کہ آپ کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ نیت کی بات نہیں کرتا، البتہ آپ کے عمل سے صاف ظاہر ہے کہ آپ صوبوں کے درمیان نفرت کے بیج بونے میں پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں آپ نے پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر سندھ اور بلوچستان کا دورہ کیا ہے اور اس دورے کے دوران ہر وہ بات کی ہے جس سے صوبوں کے درمیان دوری پیدا ہو۔ اپنی عمر اور بیماری کو ایک طرف رکھ کر اس خاص موقع پر آپ نے یہ دورہ بلاوجہ نہیں کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کے اندر اور باہر ایسی قوتیں جنم لے چکی ہیں کہ اگر ان کے درمیان اشتراک عمل ہو جائے تو رہے سہے پاکستان کا نقشہ آپ کے من پسند طریقے سے بدلا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب وسائل صوبوں کو منتقل ہونے والے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ پنجاب کے پاس کچھ نہیں۔ آپ کو فکر ہے کہ پنجاب کچھ لے نہ مرے۔ آپ کو کالا باغ ڈیم پر اصل اعتراض صرف یہی ہے کہ یہ پنجاب میں کیوں بن رہا ہے۔ جن پٹھان ماہرین نے یہ منصوبہ بنایا، اسے پروان چڑھایا اور اس کی نگرانی کی انہوں نے آپ کو لازماً بتایا ہو گا کہ اس سے صوبہ سرحد کو کوئی نقصان نہیں اور اگر نقصان پہنچنے کا کوئی احتمال ہے بھی تو اسے ڈیزائن میں معمولی ردّ و بدل سے دور کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں اگر آج طے ہو جائے کہ کالا باغ ڈیم کو مسترد کر کے اس کی جگہ ایک نیا ڈیم صوبہ سرحد میں بنا دیا جائے گا تو آپ بخوشی "ڈوبنے" کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ پنجاب کے دریا فروخت کر دیئے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ فروخت سے جو آمدنی ہوئی وہ کہاں گئی! وہ تو پنجاب سے باہر منگلا اور تربیلا ڈیموں پر لگ گئی۔ اب بھی آپ پنجاب سے باہر بھاشا کے مقام پر ڈیم بنوانا چاہتے ہیں۔ دراصل آپ کے دل میں یہ آرزو ہے کہ جب وسائل صوبوں کو منتقل ہو جائیں تو پنجاب وسائل سے یکسر عاری اور آپ کا دست نگر ہو اور اُس وقت آپ اسے ایسی جگہ ماریں جہاں پانی نہ ہو۔

خان صاحب! میری بات ذرا دھیان سے سنئے! اگر آپ نے کالا باغ ڈیم جیسے منصوبوں کی مخالفت ترک نہ کی تو اس سے آپ ہی کے مؤقف کو نقصان ہو گا۔ اگر آپ نے پنجاب کے پاس پانی اور بجلی جیسے اہم وسیلے بھی نہ چھوڑے تو ظاہر ہے کہ وہ صوبائی خود مختاری کے بجائے مضبوط مرکز کی حمایت پر مجبور ہو گا اور یوں فیڈریشن نہ بن سکے گی۔ آپ کی یہ مخالفت احساس دلاتی ہے کہ شاید آپ فیڈریشن بنانا چاہتے ہی نہیں۔

اپنے اس مضمون میں آپ خود لکھتے ہیں:۔

"اب چھوٹے صوبے پنجاب کی بالادستی قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ جناح صاحب کا پاکستان ختم ہو گیا۔ ہم اس پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ ہم آپ کے ساتھ اس مسئلے پر تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ایک ایسا پاکستان بنائیں جس میں تمام قومیتوں کو ان کے جائز حقوق دیئے جائیں۔ غلامی ہم نے انگریز کی قبول نہیں کی تو پنجاب کی غلامی قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کون کہتا ہے کہ پاکستان میں بسنے والے پٹھانوں' سندھیوں' بلوچوں اور پنجابیوں کو ان کے جائز حقوق نہ دیئے جائیں۔ آج کا جاگا ہوا پنجاب جانتا ہے کہ وسائل سے محروم پنجابیوں کو صوبائی حقوق کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ لٹے پٹے پنجابی عوام بلاوجہ لٹیرے کہلاتے کہلاتے تنگ آ چکے ہیں۔ اپنے حساب سے وہ ہر مقام پر ذبح ہوتے آئے ہیں۔ اوپر سے کھانے والوں کو مزا نہیں آیا۔ اب وہ قربانی کا بکرا بننے کو تیار نہیں۔ وہ بھی عزت اور وقار سے جینا چاہتے ہیں۔ ترقی ان کا بھی حق ہے۔ انہیں بھی وسائل کی ضرورت ہے۔ وہ بھی صوبائی خود مختاری چاہتے ہیں لیکن انہیں پاکستان بھی عزیز ہے بلکہ اپنی جانوں اور مالوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اس لئے خان صاحب! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آیئے میز پر بیٹھ جاتے ہیں اور حساب کر لیتے ہیں۔ اگر ہم آپ کا حصہ کھا گئے ہیں تو دین دار ہیں اور اگر بقول شاعر "ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا" کے مصداق آپ ہی قرض دار نکل آئے تو ازراہ انصاف ہمارا حصہ واپس کر دیجئے گا۔

کالا باغ ڈیم بعد کی بات ہے' اصل بات تو پاکستان کی ہے۔ اگر پاکستان کے بارے میں آپ کا دل صاف ہو جائے اور آپ اسے ایک فیڈریشن کے طور پر چلانے کے لئے تیار ہو جائیں تو باقی تمام باتیں دوران سفر طے ہو جائیں گی' لیکن ہر بات پر پنجاب کی ٹانگ کھینچنے سے تو فیڈریشن نہ بن سکتی ہے نہ چل سکتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھیں تو جن صوبائی اور علاقائی حقوق کے لئے آپ گزشتہ نصف صدی سے مصروفِ جدوجہد ہیں وہ پنجابی عوام کو ساتھ لے کر چلنے ہی سے مل سکتے ہیں۔ آخر پنجاب سے نفرت میں آپ کو اور آپ کی اولاد کو اب تک کیا حاصل ہوا؟ ایک دوستانہ مشورہ ہے پنجاب کو معاف کر دینا' اگر آپ کے لئے ممکن نہیں تو کم از کم اپنے آپ ہی کو معاف کر ڈالیں۔ ۱۹۴۷ء کی ناکامی نے آپ کے دل پر بہت بُرا اثر چھوڑا ہے۔ آپ اس زخم کو کب تک چاٹیں گے؟ پاکستان بن چکا۔ آپ ناکام اور قائداعظمؒ کامیاب ہو گئے۔ آج آپ پاکستان میں بیٹھے ہیں۔ یہ آپ کا اپنا وطن ہے۔ اپنے ماضی سے لڑنے کے بجائے پاکستان کے مستقبل کے لئے سوچئے۔ آپ تو رائے عامہ کے قائل ہیں۔ اگر عوام نے آپ کا ساتھ نہیں دیا تو مان جایئے کہ آپ غلطی پر تھے۔ غلطی کو تسلیم کر کے آگے بڑھیئے' چلئے قائداعظمؒ کا بنایا ہوا پاکستان باقی نہ رہا

تو آپ رہے سہے پاکستان ہی کو سنوار لیجئے اور یہ بھی غور فرمایئے کہ کیا یہ وطن پنجاب کو خارج کر کے باقی رہ سکے گا؟ نہیں۔ ادھر ہم بھی جانتے ہیں کہ دوسرے صوبوں سے کٹ کر پنجاب بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا آپ نے اور ہم نے اسی ملک میں اکٹھے جینا اور مرنا ہے۔ لہٰذا غصہ تھوک دیجئے اور ماضی کے اندھیروں سے نکل کر مستقبل کے اجالے کو خوش آمدید کہیئے۔

خان صاحب! آپ کو پنجاب کی فوج اور نوکر شاہی سے گلہ ہے۔ آپ نے اس کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بات کی ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ پنجابی عوام آپ سے بڑھ کر مارشل لاء نوکر شاہی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو انہی قوتوں کے خلاف ووٹ دیا تھا یہ الگ بات کہ یہ پارٹی اپنے عہد پر قائم نہ رہی۔ پنجاب کے عوام آج بھی ان قوتوں کے خلاف اٹھنے کو تیار ہیں بشرطیکہ انہیں بھروسا ہو کہ ان کی تحریک سے پاکستان کے وجود کو آنچ نہیں آئے گی۔ آیئے پاکستان کی قسم کھا کر ان قوتوں کے خلاف مل جل کر قدم بڑھائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پنجابی عوام کسی دوسرے صوبے کو غلام بنانا نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ کسی صوبے کے حقوق کے خلاف ہیں۔ ہاں وہ ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے بھی خواہاں ہیں۔ اور آخری بات۔ اب وہ گالیاں کھا کر بے مزہ ہونے لگے ہیں۔ بہتر ہے کہ انہیں گالیاں دینے کے بجائے آپ دلیل سے بات کریں اور اگر آپ کی دلیل کمزور ہے تو محبت سے بات کریں۔ پاکستان کی خاطر ہم پہلے بھی بہت کچھ مان جاتے رہے ہیں، اب بھی مان جائیں گے۔ ہم حضرت گنج بخشؒ اور حضرت گنج شکرؒ کی روحانی اولاد ہیں۔ ہم شاہ حسینؒ، وارث شاہ، بلھے شاہؒ، خواجہ فریدؒ، میاں محمدؒ، اقبال اور فیض کی زبان بولتے ہیں۔ ہم نے پورس اور احمد خان کھرل کی بہادری ورثے میں پائی ہے۔ آپ نے ہم سے چالیس سال تک دشمنی کر کے دیکھ لی اب چار دن دوستی کر کے بھی دیکھ لیں۔ انشاءاللہ دونوں کا بھلا ہو گا۔

خیر اندیش

محمد حنیف رامے

خان عبدالولی خان کا خط

بنام۔ محمد حنیف رامے

جناب رامے صاحب!

آداب! روزنامہ "جنگ" لاہور کے شمارہ ۳ جولائی ۷۸ء میں آپ کا "کھلا خط عبدالغفار خان کے نام" پڑھا۔ میں بامر مجبوری اس کا جواب آپ کو دے رہا ہوں کیونکہ خان عبدالغفار خان پیار، محبت، شرافت، شائستگی اور سیاست کی زبان میں بات کرتے ہیں اور آپ کے خط سے ظاہر ہے کہ وہ زبان آپ سمجھتے نہیں، اس لئے آپ سے آپ ہی کی زبان میں بات کرنی ہوگی۔ میں بھی وہی نصیحت آپ کو دہراتا ہوں جو آپ نے خان صاحب کو دی کہ گالیاں دینے کی بجائے آپ دلیل سے بات کریں۔ آپ اپنے اس مفصل خط کو ذرا دوبارہ پڑھ لیں تو آپ کو خود معلوم ہوگا کہ اس میں گالیاں اور طعنے کتنے ہیں اور دلائل کتنے ہیں۔ خیر میں کوشش کروں گا کہ صرف گالیوں پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ دلیل بھی موجود ہو۔ ایک بات کی وضاحت شروع میں کرتا چلوں کہ جب ہم پنجاب کی بات کرتے ہیں تو لازمی طور پر وہ اس خاص طبقے کی بات ہوتی ہے جو جاگیردار، سرمایہ دار، نوکر شاہی اور سامراج کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ شکر ہے کہ اب آپ کو اس طبقے کی وکالت کا شرف حاصل ہوا۔

سب سے پہلے تو نوکر شاہی میں پٹھان اور پنجابی کی پوزیشن کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ واپڈا کے سلسلے میں اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کے ذکر میں آپ بار بار یہ منطق دہراتے ہیں کہ یہ سب پٹھان نوکر شاہی تھی۔ یعنی آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ واپڈا کے مختلف چیئرمین بالکل بااختیار تھے اور ان کے اوپر گورنمنٹ کا کوئی ادارہ نہ تھا جو منظور نامنظور کا فیصلہ کرتا اور پھر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کے جھرمٹ میں آپ نے فیلڈ مارشل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کے ساتھ جنرل ضیاء الحق کو بھی پٹھانوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہ پٹھان کی رٹ لگا کر آپ کس کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ یہ بتانے کی زحمت اٹھائیں گے کہ قائد اعظمؒ سے لے کر آخر تک کتنے سربراہ مملکت پٹھان تھے اور نوابزادہ لیاقت علی خان سے لے کر آج تک کتنے وزرائے اعظم پٹھان رہے اور نوکر شاہی میں بتایئے کہ آپ کے وفاقی سیکرٹریٹ میں پنجابی اور غیر پنجابی کا کیا تناسب ہے اور آپ جرنیلوں کو پٹھان کے کھاتے میں ڈالتے ہیں تو کیا بتا سکیں گے کہ فوج میں پنجابی اور غیر پنجابیوں کا کیا تناسب ہے اور یہ بھی ساتھ بتائیں کہ کتنے جرنیل پنجابی اور کتنے سندھی، بلوچ اور پٹھان ہیں؟

رائے صاحب! کبھی وہ "ون یونٹ والا خفیہ دستاویز" آپ کی نظر سے گزرا۔ ایک چودھری محمد علی صاحب کا لکھا ہوا اور دوسرا میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کا (اگر نہیں دیکھا تو مجھے بتا دیجئے گا' میں ان دونوں دستاویزات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں بھجوادوں گا) تاکہ ان دونوں ذمہ دار اور ثقہ پنجابیوں کی ذہنیت اور طریقہ واردات کو پڑھ کر آپ کی بھی آنکھیں کھل جائیں' ان دستاویزات میں کھل کے لکھا گیا ہے کہ ون یونٹ کے سلسلے میں پنجاب کو بالکل خاموش رہنا چاہئے اور اس کے حق میں بیانات اور اس کی خوبیوں کی گنتی چھوٹے صوبوں سے کرائی جائے اور یہ طریقہ جاری رہے۔ پھر ایک وقت ایسا آجائے گا کہ پنجاب مرکز اور صوبہ دونوں میں اختیارات خود سنبھال لے گا۔ اسی منصوبے کے تحت تو میرے چچا ڈاکٹر خان صاحب کو یہی لیڈران کرام پھنسا کر لائے اور جب وقت آیا تو انہیں نہ صرف ہٹا یا گیا بلکہ ان کا گلا کاٹ کر خون میں لت پت آپ نے ان کو ہمارے ہاں بھیجا۔ تو قبلہ! یہ آپ کا طریقہ واردات ہے کہ آپ پنجاب کی مطلب براری کے لئے اپنی بندوق دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر چلاتے ہیں۔ یہی کچھ آپ نے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کیا (اگرچہ میں نے ان کو خبردار کیا تھا کہ ان کا بھی وہی حشر ہو گا جو ڈاکٹر خان صاحب مرحوم کا ہوا اور وہ از خود چل کر لاڑکانہ نہیں جائیں گے بلکہ ان کا جنازہ لے جایا جائے گا) اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی حشر ایک موجودہ "پٹھان" جرنیل کا بھی ہو گا۔

اسی طریقے سے آپ نے پنجاب کا پانی ہندوستان کے ہاتھ بیچنے کا مسئلہ بھی کس آسانی سے حل کر دیا کہ ساری ذمہ داری ایک پٹھان فیلڈ مارشل ایوب خان کے سر ڈال دی۔ اگر پنجاب کے لوگ واقعی اس سودے کے خلاف تھے تو آپ نے کیوں اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اور کیوں اس کے خلاف تحریک چلا کر پنجاب کے مفادات کے تحفظ کی خاطر حکومت وقت کے خلاف میدان میں نہیں نکلے۔ اس وقت پنجاب پورے پاکستان پر بلاشرکت غیرے حکمرانی کر رہا تھا۔ اس وقت اس سودے کے سلسلے میں جو اربوں روپے بین الاقوامی اداروں کی طرف سے آئے وہ لنک کنال Link Canal وغیرہ کے ٹھیکوں کے ذریعے پنجاب کو ملے۔ آپ سب اس لوٹ مار میں اس حد تک خوش تھے کہ یہ بھی کسی ماہر کے ذہن میں نہیں آیا کہ ان متبادل نہروں سے آپ ڈرینج لائن کو کاٹ رہے ہیں جس کے نتیجے میں جلد ہی آپ کی یہ زرخیز زمین سیم و تھور کی نذر ہو جائے گی۔ اس وقت بھی آپ کی نوکر شاہی اور استحصالی قوتیں خوش تھیں کہ اربوں روپے پنجاب میں خرچ ہو رہے ہیں اور آج بھی یہ لوگ خوش ہیں کہ سکارپ کے ذریعے اربوں روپے پھر پنجاب میں خرچ ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی کس کو فکر؟ اور غریب پنجابی کو کون پوچھتا ہے' نہ کل کسی نے پوچھا اور نہ آج پوچھتا ہے۔ اسی سلسلے میں دریائے سندھ کے بارے میں خان صاحب کی دلیل کو آپ نے غلط رنگ دینے کی کوشش کی۔ بات پنجاب کے دریاؤں کی تھی مگر ان دریاؤں کی جو ہندوستان اور پنجاب میں بہتے تھے۔ چونکہ پنجاب آپ نے تقسیم کروایا تو اس کے پانی کی تقسیم

بھی صرف ان دریاؤں تک محدود ہونی چاہئے تھی جو دونوں ملکوں کے درمیان مشترک تھے۔ تو دریائے سندھ پر ہندوستان کا دعویٰ آپ نے کس خوشی میں تسلیم کیا اور اس کو بھی پنجاب کے پانی کی تقسیم میں شامل کر دیا۔ اس وقت یہ پنجاب کے وکیل کہاں تھے کہ پنجاب کے حقوق کے لئے میدان میں نکل آئیں۔

باقی رہا آپ کا یہ ارشاد کہ اگر "آج کالاباغ ڈیم کو مسترد کر کے اس کی جگہ ایک نیا ڈیم صوبہ سرحد میں بنا دیا جائے گا تو آپ بخوشی ڈوبنے کے لئے تیار ہو جائیں گے" اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہر ایک منصوبے کے متعلق اس کے نقصانات اور فوائد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تربیلا ڈیم کے ذریعے اس صوبے کا کافی حصہ زیر آب آیا۔ مگر جائزے کے مطابق اس کے نقصانات بہ نسبت فوائد کم تھے تو وہ منصوبہ مکمل ہو گیا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایسا ہی ایک منصوبہ مالاکنڈ ایجنسی میں کلنگنے کے مقام پر بند باندھنے کا تھا۔ جب اس کا جائزہ لیا گیا تو بہت سی زرخیز زمین اور کافی آبادی اس کی زد میں آتی تھی۔ تو اگرچہ وہ منصوبہ صوبہ سرحد میں تھا مگر پھر بھی ہم ڈوبنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ شاید اب تو آپ کی یہ پنجابی ذہنیت کچھ سنبھل جائے۔

میرے خیال میں آپ نے جو اعتراضات اٹھائے تھے اس کا جواب تو تقریباً آ گیا ہے۔ اب آپ کی گالیوں کی طرف آتا ہوں۔ آپ نے خان صاحب کو سترے بہترے کا طعنہ دیا ہے اور بہت سی گھٹیا باتیں کی ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ کسی مہذب، تعلیم یافتہ اور شریف انسان کو زیب نہیں دیتیں۔ اگر آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ آپ ہمارے بزرگوں کو گالیاں دے کر ہمیں مرعوب کر کے اپنی قوت کا رعب جما کر ہمیں اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے سے روک سکیں گے تو یہ خام خیالی آپ جتنی جلدی اپنے ذہن سے نکالیں آپ کے لئے بہتر ہو گا۔ بلکہ اس قسم کی بے ہودہ زبان استعمال کر کے آپ ان انتہا پسند نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کنفیڈریشن سے بھی آگے جانے کا سوچ رہے ہیں اور جو آج بھی آ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ ان چالیس سالوں میں پاکستان سے ہمیں کیا ملا۔ تو آپ کا یہ تحفہ ان کے لئے ایک اور دلیل ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک بات یاد رکھیں کہ اگر آپ ہمارے بزرگوں کے متعلق ایسی ہی غلیظ زبان استعمال کریں تو آپ کوئی آسمان سے نازل شدہ مخلوق نہیں ہیں۔

رائے صاحب! آپ نے بلا ضرورت تقسیم ہند کے سلسلے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رول کو چھیڑ کر کالاباغ ڈیم کے مسئلے کو اس کے اصلی رخ سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ ہم قطعاً معذرت خواہ نہیں ہیں کہ ہم نے انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر ان قوتوں سے تعاون کیا جو حقیقتاً اس مادر وطن کی آزادی کے لئے میدان میں نکلی تھیں۔ خدائی خدمت گار اور کانگریس کی متحدہ جدوجہد کے نتیجے میں یہ ملک آزاد ہوا اور آپ کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر بیٹھنے کا شرف نصیب ہوا۔ آپ کے لیڈران کرام اور سیاسی تنظیم کا جو رول انگریز کے وقت رہا اس کے لئے اگر آپ انڈیا آفس لائبریری

لندن تشریف لے جائیں اور وہ خفیہ دستاویزات خود دیکھ لیں تو خان عبدالغفار خان کو طعنہ دینے کی بجائے شاید آپ بھی اپنا رخ اپنے لیڈرانِ کرام کی طرف پھیر لیں گے۔ ہمیں آج بھی اپنے اینٹی اسٹیبلشمنٹ کردار پر فخر ہے اور ہم اپنی ہمت اور قوت ارادی سے اپنے حقوق کے تحفظ کے ضامن ہیں۔

آپ نے ایک دھمکی دی ہے کہ "اگر آپ نے پنجاب کے پاس پانی اور بجلی جیسے وسیلے بھی نہ چھوڑے تو ظاہر ہے کہ وہ صوبائی خود مختاری کے بجائے مضبوط مرکز کی حمایت پر مجبور ہو گا اور یوں فیڈریشن نہ بن سکے گی۔" جزاک اللہ! بات بالکل واضح ہو گئی۔ وہی چودھری محمد علی والی پنجابی ذہنیت اور پالیسی جس کی وضاحت انہوں نے اس خفیہ دستاویز میں کی ہے کہ پنجاب 'صوبہ سرحد کی بجلی' بلوچستان کے کوئلے اور گیس اور سندھ کے وسائل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے مغربی پاکستان پر حکمرانی پنجاب کی ہونی چاہیے۔ اور اسی خاطر تو جناحؒ صاحب کے پاکستان کو بھی توڑنے کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان اسمبلی میں عوامی لیگ کو قطعی اکثریت حاصل تھی اور چونکہ مغربی پاکستان میں بھی دو صوبے یعنی پنجاب اور سندھ پی پی پی کے پاس تھے اور دو صوبے نیپ کے پاس۔ اس لئے اگر سرحد اور بلوچستان کے چھوٹے صوبے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے مشرقی پاکستان سے تعاون پر تیار ہو جاتے تو قومی سطح پر اکثریت کے ساتھ ساتھ وفاقی اکائیوں کی سطح پر بھی تین اور دو کی اکثریت ہو جاتی اور اس طریقہ سے پنجاب کی حاکمیت کو خطرہ لاحق تھا تو آپ لوگوں نے اس کا کیا علاج تجویز کیا؟ اپنے اقتدار کو دوام دینے کی خاطر آپ نے قائد اعظمؒ کے پاکستان کو توڑ کے رکھ دیا' اس کے باوجود آج اتنی بھی شرم محسوس نہیں کرتے اور پاکستان کے مامے بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو یہ دھمکی دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آپ نے اپنے اسی عمل اور کردار سے جناحؒ صاحب کے پاکستان کو کاٹ کے رکھ دیا تو اب باقی ماندہ پاکستان کا تو وہ تقدس بھی باقی نہیں رہا۔ اور آپ کی طرف سے یہ آوازیں کئی بار اٹھی ہیں کہ مشرقی پاکستان کے مقابلے میں مغربی پاکستان کا دفاع زیادہ آسان ہے۔ یعنی آپ ہر مسئلے کا صرف فوجی پہلو دیکھتے ہیں۔ مگر آپ یہ کیوں بھول گئے کہ اسی فوجی حل کے ذریعے تو آپ نے جناح صاحب کے پاکستان کو تقسیم کروایا اور اگرچہ اپنی قوم پر جہاد میں آپ کامیاب رہے مگر جب ایک مخالف قوت سامنے آئی تو وہی مجاہد اور غازی ہزاروں کی تعداد میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ اس ناخوش گوار اور تباہ کن تجربے کے بعد آپ کی ذہنیت نہیں بدلی اور آپ سبق سیکھنے کے موڈ میں نہیں ہیں' بلکہ آپ بھی مضبوط مرکز کی بات کر کے بالالفاظ دیگر باقی ماندہ چھوٹے صوبوں پر زبردستی حکمرانی کرنے کے لئے طاقت کے استعمال کی دھمکی دے رہے ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی ان غلط اور طاقت کے نشے میں مست پالیسیوں کے نتیجے میں کنفیڈریشن کی تجویزیں آرہی ہیں۔

مگر رامے صاحب! کان کھول کر سن لیں اور اپنے ان دوستوں اور آقاؤں کو بھی بتا دیں جو اس

قسم کی بیہودہ دھمکیوں میں آپ کے ساتھ ہیں کہ اگر پنجاب کو اب بھی ہوش نہ آیا اور وہ یہی حکمرانی اور مضبوط مرکز کی سوچتا رہا تو پھر چھوٹے صوبوں کے عوام کنفیڈریشن نہیں بلکہ مکمل خود مختاری کے لئے جدوجہد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جیسے خان صاحب نے کہا کہ ہم نے انگریز کی غلامی قبول نہیں کی تو پنجاب کی غلامی قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ذرا یہ بھی بتاتے چلیں کہ اگر فیڈریشن بننے نہیں دیں گے تو پھر کیا کنفیڈریشن بنانے کا ارادہ ہے یا پھر مضبوط مرکز کے نام پر باقی ماندہ پاکستان کو بھی بنگلہ دیشی طریقے سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کالاباغ ڈیم پر بحث کے سلسلے میں آپ نے رنجیت سنگھ کی بات بھی چھیڑی ہے کہ "اس دور میں پنجاب نے سرحد پر حکمرانی کی" اس سے آپ کی نفسیاتی کیفیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ فرق بھی صرف اتنا ہے کہ آپ اپنے آپ کو رنجیت سنگھ کا وارث تصور کر کے صوبہ سرحد پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے کتنے عرصے تک سکھ کی پنجابی حکمرانی قبول کی اور اپنی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد ہم نے اپنی ہی زندگی میں انگریز جیسی عالمی قوت سے ٹکر لی اور ملک کو سامراجیت کے چنگل سے آزاد کروالیا۔ رائے صاحب! آپ بھی ذرا بتائیں کہ آپ نے رنجیت سنگھ کے خلاف کتنی جنگیں لڑیں اور انگریز سامراج کو اس ملک سے بھگانے میں آپ کا کیا رول رہا۔ ہم حیران ہیں کہ ایک طرف تو آپ اپنے آپ کو رنجیت سنگھ کا وارث تسلیم کرتے ہیں اور پورس اور رنجیت سنگھ کو اپنا ہیرو ماننے میں فخر محسوس کرتے ہیں مگر اسی سانس میں اسلامی امہ اور اسلامی مملکت خداداد پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے نفسیاتی کردار کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

آپ رنجیت سنگھ کے وارث اور اس کو ہیرو ماننے والے ٹھہرے اور ہم آزادی کے متوالے۔ اس سلسلے میں میرا ذہن ایک طرف جا رہا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہی رنجیت سنگھ کے وارث و پرستار آج ہندوستان میں سکھوں کو امداد دے کر ایک متحدہ پنجاب کا تو نہیں سوچ رہے؟ اسی طرح سکھوں کے خالصتان اور رائے اینڈ کمپنی کے پاکستان سے ایک نیا ملک وجود میں آئے جس میں دریاؤں کی تقسیم کا مسئلہ پانی کا مسئلہ، سیم و تھور کا مسئلہ، بجلی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ زبان میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور تقسیم ہند کے وقت جو دشمنی اور قتل و غارت گری ہوئی وہ بھی دوستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ جو ایک دوسرے کے مکان جلوائے، بہو بیٹیاں اٹھائی گئیں، وہ تلخ یادیں بھی بھلا کر پنجاب کی عظمت اور رنجیت سنگھ اور پورس کے ورثا کی حیثیت سے ایک نئے باب کا اضافہ اس برصغیر کی تاریخ میں کیا جائے۔ معلوم نہیں کہ رائے صاحب کی یہ پنجابی ذہنیت کب آرام سے بیٹھے گی۔ پہلے ہندوستان کو توڑ کیا مسلمانان ہند کو تقسیم کروایا۔ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں بنگال اور پنجاب کو تقسیم کروایا۔ پنجاب کو تقسیم کروا کر گورداس پور ہندوستان کے حوالہ کروایا۔ کشمیر کو طشتری میں تحفتاً پیش کیا۔ اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کی خدمت

سرانجام دی اور پھر اسی جناح صاحب ؒ کے پاکستان کو تقسیم کروایا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو رائے صاحب کے کہنے کے مطابق یہ چھوٹے صوبے پنجاب کی حاکمیت بلاچون وچرا قبول کریں گے اور صبح شام رائے صاحب کے دربار پر وفاداری کے لئے حاضر ہوں گے، نہیں تو مضبوط مرکز کی دھمکی دے کر وہ ایک فاتح کی طرح باقی قومیتوں کو اپنا غلام بنا کر چھوڑیں گے۔ ایں خیال است و محال است و جنون۔

عبدالولی

محمد حنیف رامے کا خط

بنام۔ خان عبدالولی خان

محترم عبدالولی خان صاحب، سلام ورحمت!

باچاخان کے نام میرے کھلے خط کے جواب میں آپ نے مجھے جو خط لکھا ہے میں نے اسے بغور پڑھا ہے۔ میں نے بہت سوچا کہ اس کا جواب دوں یا نہ دوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بات ذاتیات اور جذباتیت کی طرف لڑھک جائے۔ کچھ دیر ٹھہر کر جواب دے رہا ہوں لیکن آغاز ہی میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں میری ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا ہے۔

جس خطے میں ہم آباد ہیں اس کی جغرافیائی سیاست کا نقشہ یہ ہے کہ سیاچین، افغانستان اور ایران میں جنگ چھڑی ہوئی ہے اور یہ جنگ بھارت کے ساتھ سرحدی جھڑپوں اور پاک افغان سرحد پر تخریبی دھماکوں کی صورت میں ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔ ہمارے اندرونی انتشار نے بات علیحدگی کی دھمکیوں اور کنفیڈریشن کے نعروں تک پہنچا دی ہے۔ حکومت اور اپوزیشن، دونوں امریکی مفادات کی تکمیل کے لئے واشنگٹن کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ ایسے میں پنجاب اور سرحد کے اختلافات کو ہوا دینا میرے نزدیک مناسب نہیں۔ میں اگر اس بحث میں حصہ لے رہا ہوں تو صرف اس مقصد کے پیش نظر کہ یہ اختلافات مٹائے جائیں نہ کہ ان میں اضافہ کیا جائے۔ اس بحث سے میرا اول و آخر مقصد یہ ہے کہ پاکستان ایک وفاق کے طور پر دنیا کے نقشے پر قائم و دائم رہے اور اس میں بسنے والے کچلے ہوئے عوام اور غریب طبقات سربلند ہوں۔

خان صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ پاکستان کی سلامتی اور یک جہتی کے نام پر ہی پاکستان کو توڑ کر رکھ دیا گیا۔ مضبوط پاکستان کے بجائے مضبوط مرکز کے غلط تصوّر سے لگاؤ اور صوبائی خود مختاری کے

مطالبے سے بے جا چڑ' سول اور ملٹری نوکر شاہی کے روز افزوں غلبے ' برطانوی استعمار کے بعد اقتصادی امداد کے نام پر جدید نو آبادیاتی نظام کے تسلّط اور سامراجی مقاصد کے فروغ کے لئے وجود میں آنے والے دفاعی معاہدوں میں شرکت نے پاکستان کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ ایک رویّہ تھا مگر ایک رویّہ اور بھی تھا۔ یہ آپس میں لڑائی اور نفرت کا رویّہ تھا جو ملک کو اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اندرونی انتشار کے اس رویّے کے باعث ہمارے ملک اور عوام کے دشمنوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ ان کے لئے اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ بات مرکز اور صوبوں یا صوبوں اور صوبوں یا قومیت اور قومیت کے درمیان الجھی رہے اور لوگوں کے غیظ و غضب کا رخ سامراج ' ظالم طبقات اور نوکر شاہی کے خلاف نہ مڑنے پائے۔ اگر پنجاب کے چودھری مضبوط مرکز کے غلط رویّے کا شکار ہوئے تو مجھے کہنے دیجئے کہ سندھ کے وڈیرے ' بلوچستان کے سردار اور سرحد کے خوانین نے بھی پنجاب کے خلاف نفرت کا غلط رویّہ اختیار کر لیا۔ اصل میں انہوں نے اپنے غریب عوام کو اپنے خلاف اٹھنے سے روکنے کے لئے انہیں پنجاب کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے لئے یہ دونوں رویّے غلط تھے اور غلط ہیں۔ میں یہ خط آپ کو اس پیشکش کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ آیئے ایک نئی راہ نکالتے ہیں ہم پنجاب والے کوشش کرتے ہیں کہ پنجاب مضبوط مرکز کی روائتی پالیسی ترک کر کے اور صوبائی خود مختاری کے اصول کو تسلیم کر کے وفاق کی بنیادوں پر مضبوط پاکستان کے نظریئے کو دل و جان سے اپنا لے۔ ادھر آپ بھی اندر کی لڑائی ' خصوصاً پنجاب کے خلاف نفرت کی روش چھوڑ دیں اور تنگ نظر قومیت پرستی کو خیرباد کہہ کر چاروں صوبوں کے مظلوم طبقات کی حمایت شروع کر دیں۔ یہی وہ واحد مقام ہے جہاں سے آپ اور ہم مل کر سامراج کو مؤثر طور پر للکار سکیں گے اور پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک آزاد ' مضبوط ' مربوط ' پُرامن اور خوش حال ملک بنا سکیں گے۔

خان صاحب! مجھے آپ سے گہری ہمدردی ہے۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اس درخت کی شکل میں دیکھا ہے جس پر پیلے رنگ کی آکاس بیل چڑھ جاتی ہے اور اس کا سارا رس چوس کر اسے پھولنے پھلنے سے محروم کر دیتی ہے۔ یقین جانیں آپ کا خط پڑھ کر دکھ ہوا۔ وہ شخص جس میں ملکی اور قومی سطح کا مدبّر بننے کی صلاحیت موجود ہو' اگر اپنے آپ کو تنگ نظر صوبائیت کی دیواروں میں چن لے تو یہ دکھ ہی کی تو بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے زندگی میں کئی بار سنجیدگی سے کوشش کی کہ اپنے والد محترم کی محدود سیاست سے ابھر کر کوئی وسیع تر راہ نکالیں پر ایسا نہ ہو سکا کیونکہ وہ آکاس بیل کی طرح آپ پر چھائی رہی۔

خان صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ اپنے خط میں آپ کوشش کریں گے کہ صرف گالیوں پر اکتفا نہ کیا جائے گا بلکہ دلیل بھی موجود ہو یعنی آپ گالیاں تو دیں گے ہی۔ البتہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کیا کسی دلیل سے بھی کام لے لیں گے۔ آپ نے مجھے گالیاں دینے کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ میں نے اپنے خط میں باچا خان کو "سترے بہترے" کا طعنہ دیا ہے۔ آپ نے اسے بے ہودہ زبان قرار دے کر جو

کچھ لکھا ہے اس کی غیر بے ہودگی تو ایک نہ ایک دن آپ پر خود ہی آشکارا ہو جائے گی' یہاں ذرا میری بے ہودگی پر بات ہو جائے تو بہتر ہے۔ میں نے لکھا تھا:۔

"پنجاب کے کچھ سادہ دل اکابر آپ (باچا خان) کے ارشادات کو یہ کہہ کر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ آپ سترے بہترے ہو چکے ہیں لہٰذا آپ کی کسی بات کا برا نہ مانا جائے۔ حقیقت یہ نہیں آپ کی عمر ہو سکتا ہے اب بھی سو سال کی ہو اور خدا کرے آپ مزید سو سال جئیں..........."

آپ اس زبان کو بے ہودہ کہہ رہے ہیں؟ خان صاحب! ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کے پاس دلیل نہ ہو وہ بہت جلد گالیوں پر آ جاتا ہے۔ آپ نے مجھے بے ہودہ ہونے کی گالی دینی تھی اس لئے آپ نے سترے بہترے کا لفظ اٹھا لیا اور یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ میرا موقف نہیں۔ سترا بہترا اس شخص کو کہتے ہیں جو بہکی بہکی باتیں کرتا ہو یا نیم دیوانہ ہو جائے۔ میں باچا خان کے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتا وہ "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" تو ہو سکتے ہیں' دیوانہ نہیں۔ دیوانے تو ہم ہیں جو چالیس سال سے آپ کی زم گرم سنتے چلے آتے ہیں اور پھر بھی امید لگائے بیٹھے ہیں کہ کبھی تو آپ کا دل پسیجے گا اور آپ پاکستان کے دشمنوں کے فراق میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے پاکستان بنانے کے "مجرموں" کو معاف کر کے ان کے شانہ بشانہ آگے بڑھنا پسند کریں گے۔

خان صاحب! غور فرمائیے کہ میرے رویئے کے برعکس آپ کا موجودہ رویّہ اس ملک کی سیاست کو کہاں پہنچا دے گا؟ کاش آپ نے اس کے بجائے میری وہ گزارش پیش نظر رکھی ہوتی جو میں نے باچا خان کے نام اپنے خط کے آخر میں کی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آپ نے ہم سے چالیس سال تک دشمنی کر کے دیکھ لی' اب چار دن دوستی کر کے بھی دیکھ لیں۔ اگر دوستی کی یہ پیشکش قابل قبول نہ تھی تو یہ شعر ہی پڑھ لیا ہوتا ....

؎ مت پوچھ کہ میں کس لئے محروم ہوا ہوں
یہ دیکھ کہ کیوں تجھ کو ملا حق سے زیادہ

حقیقت یہ ہے کہ آج اگر ترقی کے اعتبار سے کسی صوبے کو حق سے زیادہ مل رہا ہے تو وہ پنجاب نہیں بلکہ سرحد ہے۔ یہاں میں دولت کی اس ریل پیل کی بات نہیں کر رہا جو سمگلنگ اور منشیات کی پیداوار ہے۔ کیونکہ اس میں دوسرے صوبوں کے حصے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس پر تو سرحد کی قریب قریب اجارہ داری ہے۔ میں تو ٹرانسپورٹ' بجلی اور تعلیم جیسے شعبوں کی بات کر رہا ہوں۔ میں سیاسی' فوجی اور دفتری عہدوں کا ذکر کر رہا ہوں اور میرا اشارہ پچھلے دس بارہ سال کے ان ترقیاتی منصوبوں کی طرف ہے جو وفاقی وسائل سے مکمل ہوئے اور جن سے غلام اسحاق خان نے پنجاب کو یکسر اور مسلسل محروم رکھا ہے۔

یہ آخری بات ذرا وضاحت چاہتی ہے۔

صوبہ سرحد پر جب تک جنرل فضل حق کی حکمرانی رہی وہ مرکز سے جو ترقیاتی منصوبہ مانگتے اسے دھونس کے ساتھ منظور کرا لیتے تھے۔ اونچی میٹنگوں میں غلام اسحاق خان اور جنرل فضل حق بظاہر آپس میں لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے تھے لیکن یہ لڑائی جھگڑا نورا کشتی سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ راولپنڈی کی طرف سے اٹک کا پل پار کرتے ہی نقشہ بدل جاتا ہے۔ سڑکوں کی حالت' تعمیرات کی رفتار' درختوں کی کثرت' بجلی کے کھمبوں کی تعداد اور پولیس کی وردیوں میں سے جس چیز پر بھی نظر پڑ جائے وہ گواہی دیتی ہے کہ گذشتہ برسوں کے دوران سرحد میں ترقی کی وہی رفتار رہی ہے جو آپ کے رقیب قیوم خان مرحوم نے اپنے دور میں قائم کی تھی۔ مارشل لاء کے تواتر میں جنرل فضل حق نے خواہ جو بھی کردار ادا کیا اور اس پر چاروں صوبوں کے جمہوریت پسند عوام کو جتنا بھی اعتراض ہو مگر وہ سرحد کی ترقی کے اعتبار سے یاد رکھے جائیں گے۔ خان صاحب! برا نہ مانئے پچھلے سالوں میں آپ کی سیاست سے سرحد کے عوام کی عدم دلچسپی کے دو ہی بڑے باعث ہیں' ایک جنرل فضل حق کا عہد گورنری اور دوسرا افغانستان کا انقلاب۔

جنرل فضل حق کا مقابلہ پنجاب کے گورنر' جنرل جیلانی سے کیا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ فضل حق کو شوق تھا کہ ترقیاتی کاموں کے ذریعے قیوم خان کی یاد مٹا دیں۔ گذشتہ پینتیس سال سے لوگ کہہ رہے تھے کہ سرحد میں ترقی وہیں رکی کھڑی ہے جہاں قیوم خان چھوڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ بجلی کا جو کھمبا قیوم خان کے وقت لگ گیا اس سے آگے دوسرا کھمبا نہ لگ سکا۔ گورنر فضل حق نے نہ صرف اگلا کھمبا لگوا دیا بلکہ آج حالت یہ ہے کہ پنجاب کے چالیس فیصد دیہات کے مقابلے میں سرحد کے پینسٹھ فیصد دیہات میں بجلی پہنچ گئی ہے۔ ادھر گورنر جیلانی لاہور میں پارک بنوا رہے تھے' فوارے لگوا رہے تھے اور چڑیا گھروں کو ترقی دے رہے تھے۔ وہ اور کرتے بھی کیا۔ غلام اسحاق خان مانتے تو پنجاب کو بھی کچھ ملتا۔ آپ کہیں گے کہ جب اوپر پنجابی صدر بیٹھا تھا تو پنجاب کیوں محروم رہا۔ خان صاحب' اول تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صدر صاحب صوبہ سرحد کے باسی (ڈومی سائل) ہیں۔ دوسری طرف دولت کی پیدائش اور تقسیم کے منصب پر تو غلام اسحاق ہی بلا شرکت غیرے فائز رہے۔ بہر حال کسی حد تک غلام اسحاق خان کی وزارت خزانہ کے قلمدان کی بدولت' لیکن اس سے بہت زیادہ بڑھ کر جنرل فضل حق کی گورنری کے باعث صوبہ سرحد کے باشندوں کو "آج" ہی وہ سب کچھ میسر آ گیا جو آپ "آنے والے کل" میں انہیں مہیا کرنے کا وعدہ اور دعویٰ کر رہے تھے۔ کہتے ہیں "نو نقد نہ تیرہ ادھار۔" جب نو کی جگہ تیرہ کے تیرہ نقد مل گئے تو لوگوں کو ادھار کی امید دلانے والوں کی کیا ضرورت تھی۔

اوپر سے افغانستان میں انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب نے افغانستان کے ساتھ ظاہر شاہ اور صدر

داؤد کے زمانے سے قائم آپ کے تعلق کے بندھن توڑ دیئے اور پہلی مرتبہ آپ کو کابل کے بجائے اسلام آباد کی جانب دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان دنوں آپ نے صدر ضیاء الحق کے ساتھ بہت کھانے کھائے مگر پھر افغان مہاجروں کی آمد نے کام خراب کر دیا۔ اب اونٹ کے منہ میں چھچھوندر والا معاملہ ہو کر رہ گیا۔ آپ نہ تو افغان مہاجروں کو خوش آمدید کہہ سکتے تھے اور نہ خدا حافظ۔ آپ نے ان سے جتنی بھی بھائی بندی جتائی ان کی واضح اکثریت آپ کے خلاف ہی رہی۔ نتیجتہً پاکستان میں آپ کی سیاست اس حد تک محدود ہو کر رہ گئی کہ آپ کی جماعت کے صدر شیرباز مزاری صاحب بھی آپ سے کنارہ کش ہو گئے۔

یہ وہ دن تھے جب میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پشاور میں آپ سے ملنے آیا۔ ایک نہیں دو مرتبہ۔ میں نے آپ کے سامنے آزاد خارجہ پالیسی، مساویانہ اقتصادی نظام اور وفاقی نظام حکومت کی بنیادوں پر وسیع تر اتحاد بنانے کی تجویز رکھی۔ لیکن آپ شاید صرف نیپ کے بکھرے ہوئے اجزاء اکٹھا کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے یا پھر آپ کی پریشانی یہ تھی کہ اگر اس اتحاد میں پنجاب کے خوددار عوام کے نمائندے بیٹھے ہوتے تو ان کی موجودگی میں آپ پنجاب کو کیونکر برا بھلا کہتے۔ اس صورت میں سیاست کی وہ دکان بند ہو جانے کا بھی خطرہ تھا جو آپ نے آج تک پنجاب دشمنی ہی کے حوالے سے چلائی اور چمکائی تھی۔

اپنے خط میں آپ نے سب سے پہلا سوال یہ اٹھایا ہے کہ نوکر شاہی کے سلسلے میں پٹھان اور پنجابی کی وضاحت ضروری ہے اور مجھے یہ بتانا چاہئے کہ شروع سے لے کر آخر تک کتنے سربراہان مملکت اور کتنے وزرائے اعظم پٹھان تھے سول اور ملٹری نوکر شاہی میں پٹھان اور پنجابی کا تناسب کیا ہے، خصوصاً جرنیلوں کی صوبہ دار تقسیم کیا ہے؟ دیکھئے خان صاحب! پٹھان اور پنجابی کی اصطلاح استعمال کر کے آپ بحث کو تنگ نظر قومیت پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ادھر جب میں صوبہ سرحد اور پنجاب کی بات کرتا ہوں تو میرے پیش نظر دونوں صوبوں کے کچلے ہوئے غریب اور مظلوم طبقات کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ میں نے باچا خان کے نام اپنے خط میں واضح کیا تھا کہ آپ کو پنجاب کے خلاف سب سے بڑی شکایت ہی یہ ہے کہ اس نے پاکستان بنانے میں کیوں حصہ لیا۔ ابھی چند روز ہوئے کراچی سے آپ کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں آپ نے اپنی بار بار کی کہی ہوئی یہ بات ایک بار پھر دہرائی ہے کہ شکر ہے آپ پاکستان بنانے کے "جرم" میں شریک نہیں تھے۔ مجھے احساس ہے کہ اپنے آپ کو بری قرار دے کر آپ اس جرم کو پنجاب کے سر ڈال رہے ہوتے ہیں۔ یقین جانئے کہ پنجاب کے عوام کو پاکستان بنانے میں شرکت پر فخر ہے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ملک پورے برِّ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں بنا اور اس جدوجہد میں سرحد کے غیور اور عظیم عوام برابر کے شریک تھے۔ ہم سرحد کے ان مسلمان

عوام کو پاکستان بنانے پر سلام کرتے ہیں جنھوں نے آپ کی 'سرحدی گاندھی کی اور مہاتما گاندھی کی بات رَد کر دی اور قائد اعظمؒ کی بات تسلیم کر کے ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔

خان صاحب! آپ پنجاب اور اس کے عوام سے خواہ مخواہ ناراض ہیں۔ آپ کی ناراضگی کا رخ یا تو کانگریس کے خلاف ہونا چاہئے تھا جس نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا یا پھر سرحد کے پٹھان عوام کے خلاف جو پاکستان بنانے کے جرم میں پنجاب کے عوام کے شانہ بشانہ شریک تھے اور جنھوں نے اس معاملے میں آپ کی ایک نہ سنی اور مہاتما گاندھی کی ہندوستانی نیشنلزم کے بجائے قائد اعظمؒ کی مسلم نیشنلزم یا دو قومی نظریہ قبول کر لیا۔

اب آیئے حساب کتاب کی طرف اور یاد رہے کہ میں یہ حساب کتاب پٹھان اور پنجابی عوام نہیں بلکہ سرحد اور پنجاب کے صوبوں کے حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ پاکستان کی ۳۹ سالہ زندگی میں زیادہ عرصہ مارشل لاء لگا رہا۔ ایوب خان کے گیارہ سال یحیٰی خان اور بھٹو مرحوم کے تین سال اور پھر ضیاء الحق کے نو سال کل ۲۳ سال بنتے ہیں (جب تک صدر ضیاء الحق وردی نہیں اتارتے اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق وزیر اعظم کا عہدہ با اختیار نہیں ہو جاتا' میرے نزدیک مارشل لاء جاری ہے)۔ مارشل لاء کے یہ چاروں چیف ایڈمنسٹریٹر پنجاب کے باشندے نہیں اور اگر بھٹو مرحوم کے چند ماہ کے مارشل لاء کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ سندھ سے تعلق رکھتے تھے تو مارشل لاء کا بقیہ تمام عرصہ صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے جرنیلوں ہی کی حکمرانی شمار ہو گا۔

جہاں تک مارشل لاء کے علاوہ عرصے کا تعلق ہے تو اس دوران پارلیمانی نظام حکومت قائم تھا جس میں وزیر اعظم اصل حکمران ہوتا ہے اور آج تک صرف دو پنجابی وزرائے اعظم سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے چودھری محمد علی کے تیرہ ماہ اور ملک فیروز خان نون کے دس ماہ' دونوں کی کل حکومت ۲۳ ماہ بنتی ہے۔ چلئے' دو سال کہہ لیجئے ۳۹ سال میں سے ۲۳ سال مارشل لاء کے نکال دیجئے۔ باقی بچے ۱۶ سال۔ گویا جمہوریت کے ان سولہ سالوں میں پنجاب نے دو سال حکومت کی اور مارشل لاء کے دوران صفر۔ تو حقیقی صورت حال یہ بنی کہ ۳۹ سال میں سے صرف دو سال کے لئے پنجاب کا کوئی باشندہ پاکستان کا سربراہ رہا۔

آپ کہیں گے کہ غلام محمد جیسا مطلق العنان پنجابی گورنر جنرل کدھر گیا؟ اسے کیوں نہیں گنا گیا؟ اگر کچھ دیر کے لئے ایسا کر بھی لیا جائے تو صوبہ سرحد کے ۲۳ سالوں کے مقابلے میں پنجاب کے صرف چھ سال ہی بنتے ہیں۔ گو وزرائے اعظم کی فہرست میں صوبہ سرحد کے باشندے نظر نہیں آتے لیکن ملک کی ۳۹ سالہ تاریخ میں اس صوبے کے جرنیل ۲۳ سال تک تخت پر بیٹھے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ پھر وزرائے اعظم کے ساتھ اگر آپ گورنر جنرل غلام محمد کو گننے پر مصر ہیں تو مجھے ون یونٹ کے دو پٹھان

وزرائے اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب اور سردار عبدالرشید کو بھی پاکستان کے سربراہوں میں شمار کر لینے دیجئے۔ کیونکہ اس وقت کا مغربی پاکستان آج کے پورے پاکستان ہی کا دوسرا نام تھا۔

جہاں تک فوج میں صوبہ سرحد اور پنجاب کے تناسب کی بات ہے تو ملک میں پنجابیوں کی آبادی ۶۳٪ ہے۔ تریسٹھ فی صد آبادی کی فوج میں نمائندگی ساٹھ فی صد ہے۔ ہے اپنے حصہ سے تین فیصد کم۔ باقی تینوں صوبوں کی آبادی مل کر ۳۷ فیصد ہوتی ہے۔ لیکن فوج میں اکیلا صوبہ سرحد چالیس فیصد حصہ لے جاتا ہے۔

خان صاحب! سندھ یا بلوچستان شکایت کریں تو بجتے ہیں کہ انہیں فوج میں متناسب نمائندگی حاصل نہیں۔ مگر آپ یہ شکایت کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ نہ صرف اپنا پورا حصہ بلکہ سندھ اور بلوچستان کا پورا پورا حصہ اور اوپر سے پنجاب کا تین فی صد حصہ لے جاتے ہیں اور پھر بھی اعتراض اٹھاتے ہیں۔ رہی جرنیلوں کی تعداد تو یہ کبھی صوبہ سرحد کے حق میں اور کبھی پنجاب کے حق میں کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ اتنی بات طے ہے کہ اپنی آبادی کے مقابلے میں فوجی افسروں میں صوبہ سرحد کا تناسب ہمیشہ ہی بہت زیادہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔

اب آیئے نوکر شاہی کی طرف۔ چھوٹے ملازموں میں بے شک پنجاب کی اکثریت ہو مگر اونچی ملازمتوں میں "خصوصاً پی آئی اے' بنکوں اور دوسرے خود مختار وفاقی اداروں میں چھوٹے صوبوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کی نمائندگی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یہ نوکریاں زیادہ تر ہمارے مہاجر بھائیوں کے پاس رہی ہیں۔ البتہ اب آہستہ آہستہ کچھ تبدیلی آ رہی ہے۔ چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں لیٹرل انٹری اور صدر ضیاء کے عہد میں سندھ کے احساس محرومی کے نعرے نے صوبوں کا گراف کسی حد تک بہتر بنا دیا ہے۔ بہر حال ان نوکریوں میں اگر آپ بہت کم ہیں تو ہم بھی زیادہ نہیں اور جو زیادہ ہیں انہیں کیا پاکستان میں نوکری بھی نہیں ملنی چاہئے؟

یہاں ایک ذاتی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ طنزاً کہیں یا سنجیدگی سے کہ حنیف رامے پنجاب کا وکیل ہے' بہر صورت مجھے اس پر اعتراض نہیں۔ اس بے زبان صوبے کے غریب اور مظلوم عوام کی ترجمانی پر مجھے فخر ہے۔ لیکن آپ مجھے "پنجاب کے جاگیرداروں' سرمایہ داروں' نوکر شاہی اور سامراج کے مفادات کی وکالت" کا طعنہ دیں تو یہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ خان صاحب! آپ تو اپنے علاقے کے جاگیردار کہلا سکتے ہیں۔ چلئے' آپ کو جاگیردار کی اصطلاح ناپسند ہے' بہر حال آپ وہاں کے بڑے زمینداروں میں سے تو ہیں۔ آپ کے بھائی بند کل تک لوگوں کو حد نظر تک پھیلی ہوئی زمین دکھا کر بتاتے رہے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے۔ آپ کے علاقے کے مزارعین ہشت نگر کی انقلابی تاریخ کو گواہ بنا کر کہیں گے کہ آپ ان کے نہیں جاگیرداروں کے نمائندہ ہیں۔ اس کے برعکس اس وقت تک اللہ کی

وسیع دنیا میں میری یا میرے اہل وعیال کی ایک مرلہ زمین نہیں اور نہ ایک اینٹ کا گھر ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے طبقاتی مفادات کیا ہیں۔ میری کتاب "پنجاب کا مقدمہ" کا ورق ورق شاہد ہے کہ میں جاگیردارانہ 'سرمایہ دارانہ 'نوکر شاہی اور سامراجی مفادات کا نہیں بلکہ غریب عوام کا ایک ایسا ترجمان ہوں جو پنجاب کے ساتھ ہونے والے تاریخی تشدد اور سیاسی ظلم کا شدید ترین احساس رکھتے ہوئے بھی پاکستان کو ایک وفاق بنانے اور ایک وفاق کے طور پر چلانے کے ضمن میں پنجاب کی ذمہ داریوں کا شعور رکھتا ہے۔ میرے اسی شعور نے مجھے اس راہ پر ڈالا کہ میں آپ اور محترم غوث بخش بزنجو سے باہمی اتحاد کے لئے مذاکرات کروں۔ یہ الگ بات کہ آپ نے پنجاب دشمنی میں اتحاد کی اس پیشکش کو نہ صرف رد کر دیا بلکہ میرے امریکی ایجنٹ ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی جاری کر دیا۔ آپ کے منہ سے ایجنٹ ہونے کا طعنہ میرے لئے اس وجہ سے پریشانی کا باعث نہیں کیونکہ آپ قائداعظمؒ کو بھی انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیتے آئے ہیں اپنے اس خط میں بھی آپ نے لکھا ہے "آپ کے لیڈران کرام (قائداعظمؒ) اور سیاسی تنظیم (قائداعظمؒ کی مسلم لیگ) کا جو رول انگریز کے وقت رہا اس کے لئے آپ انڈیا آفس لائبریری لندن تشریف لے جائیں اور خفیہ دستاویزات خود دیکھ لیں۔" ظاہر ہے کہ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہ رول انگریز کے ایجنٹوں کا تھا۔ ویسے خان صاحب! لوگ اکثر آپ کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں کہ ولی خان روس کے ایجنٹ ہیں یا بھارت کے۔ اور آپ کو بھی وضاحت کرنی پڑتی ہے کہ نہیں 'میں تو صرف پاکستان کا ایجنٹ ہوں۔ ذرا غور فرمایئے کہ اگر آپ پاکستان بنانے کے جرم میں شریک نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے ایجنٹ ہو سکتے ہیں تو قائداعظمؒ اور ہم پنجاب والے اس جرم میں شریک ہوتے ہوئے پاکستان کے ایجنٹ کیوں نہیں ہو سکتے؟

اب اس وضاحت کے بعد دیکھئے کہ ون یونٹ کس نے بنایا اور جب ون یونٹ بن گیا تو اس کا سربراہ کون بنا؟ اس سلسلے میں آپ نے "چودھری محمد علی مرحوم" اور میاں ممتاز دولتانہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ کو ون یونٹ کے معمار کے طور پر جنرل اسکندر مرزا کا نام کیوں یاد نہ آیا جس کی ترغیب پر آپ کے چچا ڈاکٹر خان صاحب مرحوم ون یونٹ کے پہلے چیف منسٹر بننے پر راضی ہو گئے۔ آپ نے پنجاب سے اپنے مرحوم چچا کا جنازہ آنے کی بات بھی کی ہے اور کہا ہے کہ انہیں پنجابیوں نے "پھنسا" لیا تھا۔ نہیں 'انہیں اسکندر مرزا نے پھنسایا تھا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ پنجاب نے نہ صرف آپ کے چچا کی خون میں لت پت لاش آپ کے یہاں بھیجی بلکہ اس نے یہی کچھ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ بھی کیا۔ خوب رہی۔ "پہلے احتساب پھر انتخاب" کا نعرہ تو آپ لگائیں جس کا سیدھا سادا مطلب تھا کہ مارشل لاء والوں کو پہلے بھٹو صاحب کو احتساب کے نام پر پھانسی دینی چاہئے اور جب تک وہ راستے سے ہٹا نہ دیئے جائیں انتخابات نہ کرانے چاہئیں۔ اسی طرح جب آپ جیل سے رہا ہوئے تو آپ کے کلام میں

ٹیپ کا مصرع ہی یہ ہوتا تھا کہ " موذی سانپ ایک فوجی کے بوٹ تلے آ گیا ہے لیکن ابھی تک اس کا سر نہیں کچلا گیا۔ " مطلب تھا کہ بھٹو صاحب کا سر کچلا جائے۔ ان دنوں آپ اسلام آباد کے بہت پھیرے لگاتے تھے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو آپ بھٹو صاحب کو پھانسی دلانے اور ان کا سر کچلنے کے لئے بے چین تھے اور دوسری طرف آپ نے بھٹو مرحوم کو بھی خبردار کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ یہ اچھا روّیہ ہے کہ جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔

ون یونٹ سے آپ کو ہمیشہ کد رہی۔ میں بھی اس تجربے کو پاکستان کی بدقسمتی سمجھتا ہوں۔ ہم میں سے کسی نے اس سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اگرچودھری محمد علی جیسے "نوکری پیشہ حاکم" اور ممتاز دولتانہ جیسے "جاگیردار سیاستدان" آنے والے دنوں میں ون یونٹ میں پنجاب کا کوئی فائدہ دیکھتے بھی تھے تو وہ فائدہ پنجاب کو نہیں پہنچا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ آپ کے چچا مرحوم کی قائم کردہ ری پبلکن پارٹی کے لئے اقتدار کا راستہ کھل گیا گو یہ پارٹی نہ تو کبھی منتخب ہوئی اور نہ اس نے عوام سے رجوع کیا۔ بلکہ ڈاکٹر خان کی اس مثالی جمہوری جماعت نے جس طرح پینترے بدل بدل کر حکومت کی۔ اس نے موقع پرستی کی ایسی شاندار روایات چھوڑی ہیں کہ جونیجو صاحب کے تحت مسلم لیگ کے نام پر بننے والی مجرم لیگ بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ پائی۔ ڈاکٹر خان کی پارٹی کی موقع پرستی دیکھنی ہو تو طرز انتخاب کے مسئلے پر اس کی قلابازیاں دیکھ لیں۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں جاری ہونے والے منشور میں انہوں نے مخلوط انتخابات کی حمایت کی۔ ڈاکٹر خان نے جداگانہ انتخابات کے حامیوں کو "غلامانہ ذہنیت کے حامل" کا خطاب دیا۔ لیکن تین ہی مہینے بعد وہ اس معاہدے کے فریق بن گئے جس کے مطابق مشرقی پاکستان میں تو مخلوط انتخابات ہونے تھے مگر مغربی پاکستان میں (یعنی ون یونٹ میں جس کے سربراہ ڈاکٹر خان خود تھے) جداگانہ انتخابات منعقد کرا کے "غلامانہ ذہنیت" کا ثبوت دیا جانا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر خان کی جماعت نے عوامی لیگ کے ساتھ ملک بھر کے لئے مخلوط انتخابات پر اتحاد کر لیا اور جب اکتوبر ۱۹۵۷ء میں سہروردی صاحب کی وزارت کا بھٹہ بیٹھ گیا تو ری پبلکن پارٹی نے جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر اس مسلم لیگ سے اتحاد کر لیا جس میں نقب لگا کر اور جس کی کمر توڑ کر یہ معرض وجود میں آئی تھی۔ یاد رہے کہ مارچ ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر خان کی وفات کے بعد بھی صوبہ سرحد کے سردار عبدالرشید ون یونٹ کے چیف منسٹر بنے تھے اور جہاں تک ری پبلکن پارٹی کا تعلق ہے تو اس نے مغربی پاکستان یا موجودہ پاکستان کی تبھی جان چھوڑی تھی جب ایوب خان کا مارشل لاء آ گیا تھا۔

تو آپ نے غور فرمایا کہ ون یونٹ کس نے بنوایا اور اس پر کس نے حکومت کی اور حکومت کرنے کے لئے ری پبلکن پارٹی جیسی موقع پرست تنظیم کس نے بنائی؟ خان صاحب! عجیب بات ہے کہ اگر ون یونٹ بنے تو حکمرانی کے لئے صوبہ سرحد بلکہ آپ کا خاندان تیار ہو جائے، مارشل لاء آئے تو حکمرانی صوبہ

سرحد کے حصے میں آئے اور آپ کا جی چاہے تو ون یونٹ اور مارشل لاء کا حوالہ دے کر پنجاب کی مٹی پلید کر ڈالیں آخر کیوں؟ کیا محض اس لئے کہ پنجاب میں بزرگوں سے اونچا بولنا اچھا نہیں سمجھا جاتا اور ہم آج تک آپ کو بھی بزرگ سمجھتے آئے ہیں۔

اپنے خط میں آپ نے دریاؤں کے مسئلے پر بھی بات کی ہے۔ آپ اصرار کرتے ہیں کہ پنجاب کے دریا پنجابیوں نے خود بیچے' میں کہتا ہوں کہ یہ دریا امریکی دباؤ کے تحت بیچے گئے اور بیچنے والا صوبہ سرحد کا باشندہ تھا جسے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے امریکی تائید چاہئے تھی اور امریکہ نے اس تائید کی قیمت اس سے سندھ طاس کے معاہدے کی شکل میں وصول کی تھی۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ سندھ طاس کے معاہدے کے عوض ملک کو جو اربوں روپے کی امداد ملی وہ پنجاب میں ٹھیکوں وغیرہ پر خرچ ہوئی۔ خان صاحب! آپ کتنی آسانی سے بھول گئے کہ اس امداد سے منگلا اور تربیلا ڈیم بنے جنہیں کمال احتیاط سے پنجاب کی حدوں سے باہر بنایا گیا۔ پہلا آزاد کشمیر میں دوسرا صوبہ سرحد میں اور جہاں تک ٹھیکوں کا تعلق ہے غیر ملکی امداد تو ملتی ہی اس شرط پر ہے کہ بڑے بڑے ٹھیکے امداد دینے والے ممالک کی اپنی کمپنیوں کو ملیں گے اور یہی وہ راز ہے جس سے کھلتا ہے کہ بیرونی امداد کے نام پر دراصل بیرونی ممالک تجارت کرتے ہیں اور بس۔ باقی رہے چھوٹے ٹھیکے تو خان صاحب! پنجاب اور سرحد کے ٹھیکہ داروں کا تناسب دیکھ لیں کہ کس کا پلہ بھاری رہا کیا حبیب اللہ خان اور نجیب اللہ خان اور کیا ہشتم خان اور اسلم خان' ان کا ایوب خان سے رشتہ تھا یا نہیں' اس دور میں سرحد کے بیسیوں ٹھیکہ داروں نے خوب خوب ہاتھ رنگے۔ البتہ کچھ ٹھیکے پنجابیوں کو بھی مل گئے ہوں تو کیا غضب ہو گیا۔

آپ نے سکارپ کی بات بھی کی ہے۔ آپ کو پنجاب پر خرچ ہونے والی رقم پر خاصا رنج ہے۔ مگر آپ نے اندازہ نہیں کیا کہ ۶۳ فیصد آبادی کے صوبے پر ہو سواتنی ہی رقم خرچ ہوئی جتنی بیس فیصد آبادی کے صوبہ سندھ پر' آپ نے اس پر کیوں اعتراض نہیں کیا؟ پنجاب میں سکارپ پر جو بھی خرچ ہوا وہ صرف اس لئے تھا کہ بعد میں پنجاب کو دریاؤں اور متبادل نہری پانی سے محروم رکھنے کے لئے جواز پیش کیا جا سکے کہ اس کے پاس زیر زمین پانی کے بہت وسائل ہیں۔

خان صاحب! بہتر یہی ہے کہ آپ اور ہم میز پر بیٹھ جائیں اور حساب کر لیں۔ اگر ہم آپ کا کچھ کھا گئے ہیں تو اصل زر مع سود ادا کرنے کو تیار ہیں اور اگر آپ کے ذمہ کچھ نکل آئے تو بلا سود واپس کر دیجئے۔ لیکن خدا کے لئے آپ غریب پنجابی کی فکر میں دبلے نہ ہوں۔ آپ نے اور ان پنجابی جاگیرداروں نے جو آپ کے دوست ہیں غریب پٹھان کی طرح غریب پنجابی کا بھی پورا پورا استحصال کیا ہے۔ ہم بڑی مشکل سے غریب پنجابیوں میں قیادت کا حوصلہ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ آپ کے طبقے کی چکنی چپڑی بہت سن چکے۔ آپ اس دن سے ڈریں جب غریب پٹھان آپ کی تنگ نظر قومیت پرستی کو رد کر کے پاکستان

کے اجتماعی اور اپنے طبقاتی مفادات پہچان کر دوسرے صوبوں کے غریب عوام کے ساتھ آ کھڑے ہوں گے اور ایسا بڑی تیزی سے ہو بھی رہا ہے۔

آیئے اب کچھ زیادہ گہری باتیں ہو جائیں۔ سب سے پہلے سکھوں کے ساتھ مل کر عظیم تر پنجاب یا ایک نیا ملک بنانے کی بات لے لیجئے۔ آپ نے میری یہ وضاحت تو بڑے آرام سے بھلا دی کہ اہل پنجاب حضرت بابا گنج شکرؒ اور حضرت داتا گنج بخشؒ کی روحانی اولاد ہیں۔ اور وہ شاہ حسینؒ 'وارث شاہؒ' سلطان باہوؒ' بُلھے شاہؒ 'خواجہ فریدؒ 'اقبالؒ اور فیض کی محبت بھری زبان بولتے ہیں۔ لیکن آپ نے اپنے خط میں رنجیت سنگھ کا بار بار ذکر کر کے اسے میرے ہیرو کے طور پر پیش کر دیا۔ جب میری کتاب "پنجاب کا مقدمہ" شائع ہوئی تو بعض مبصّروں نے پڑھے بغیر اس پر تبصرے کئے۔ انہوں نے بات چلائی کہ میں پورس کی طرح رنجیت سنگھ کو اپنا ہیرو سمجھتا ہوں۔ آپ نے انہی مبصّروں کا جھوٹ مجھ پر تھوپ دیا ہے۔ میں نے سکھوں کے صوبہ سرحد پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں کہا تھا کہ بہتر یہ ہے کہ آپ اس واقعہ کو ہمارے بجائے تاریخ کے سر ڈال کر ہمیں معاف کر دیں۔ لیکن آپ تو دو ہاتھ اس سے بھی آگے چل دیئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے رفقا بھارتی پنجاب کو ساتھ ملا کر عظیم تر پنجاب یا ایک نیا ملک بنانا چاہتے ہیں۔ خان صاحب! سنئے آپ شاید رنجیت سنگھ اور ہری سنگھ نلوہ کو بھول جائیں کیونکہ وہ ڈیڑھ سو سال پرانے لوگ تھے۔ لیکن پنجاب کی موجودہ نسلیں ماسٹر تارا سنگھ کو نہیں بھول سکتیں۔ آپ کے زخم پرانے ہو چکے ہیں مگر ہمارے زخم ابھی ہرے ہیں۔ آج میرے پنجاب کا ہر دوسرا تیسرا گھر ایسا ہے جس کے افراد سکھوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ہم نے سکھوں ہی سے ملنا ہوتا تو پاکستان کیوں بناتے؟ پھر سکھوں سے ہماری تو نہیں آپ کی رشتہ داری ہے! رشتہ داری کی بات چلی ہے تو ذرا بھارت سے اپنے رشتوں پر بھی نظر دوڑا لیجئے۔ ہماری سرحدیں تو اس سے لڑتے ہوئے دو مرتبہ خون میں نہا چکی ہیں 'ہم میں سے کوئی بھارت جائے تو کیا اس کی وہ آؤ بھگت ہو گی جو آپ کی وہاں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ میری نہیں' اپنے خاندانی دوست کشمیر کے شیخ عبداللہ مرحوم کی زبانی سنئے کہ اس خصوصی رشتے کی کیا نوعیت ہے

> "بادشاہ خان کچھ دیر بعد (گاندھی جی کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ۷۱-۱۹۷۰ء) ہندوستان میں رہنے کے بعد واپس کابل جانے کے لئے تیاری کرنے لگے۔ جو رقومات ان کو پیش کی گئیں ان کی مالیت چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ یہ مرد قلندر یہ رقم اپنے ساتھ لے گیا اور اس کو زرمبادلہ میں تبدیل کرا لیا۔"

> "میں بھی تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملاقات کر رہا تھا۔ اپنے

دیرینہ دوست کو میں نے جسمانی لحاظ سے تو کافی کمزور پایا لیکن ان کا ذہن خوب چاق و چوبند تھا۔ انہیں کانگریس کی قیادت سے زبردست شکوے تھے اور وہ سمجھتے تھے کانگریس کے نظریات سے ان کی غیر متزلزل وفاداری کے باوجود وقت آنے پر کانگریسی رہنماؤں نے انہیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا۔ " (آتش چنار صفحہ ۸۲۹،۸۲۸)

شیخ عبداللہ کی تحریر میں چالیس لاکھ کی رقم کے ذکر کو جانے دیجئے۔ اصل اہمیت رقم کی نہیں، دینے اور لینے والے کے باہمی تعلق کی ہے۔ اسی طرح بات کانگریس کے نظریات سے باچاخان کی غیر متزلزل وفاداری کی ہے یا پھر ان کے اس احساس کی کہ وقت آنے پر کانگریسی لیڈروں نے انہیں "بھیڑیوں" کے حوالے کر دیا۔ خان صاحب! یہ کون لوگ ہیں جنہیں شیخ عبداللہ کے بقول باچاخان بھیڑیا قرار دے رہے ہیں؟ کہیں یہ قائد اعظمؒ اور لیاقت علی خانؒ کی طرف تو اشارہ نہیں؟ اپنے خط میں ایک جگہ آپ نے کشمیر کے بارے میں کہا ہے کہ پنجابیوں نے اسے طشتری میں رکھ کر تحفتاً دے دیا مگر شیخ عبداللہ تو اپنی کتاب میں کوئی اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاد کشمیر میں حصہ لینے والے قبائلی سردار بارہ مولا میں مسلمانوں ہی کی عزت اور دولت سے کھیلتے رہ گئے اور انہوں نے سری نگر پہنچنے میں اتنی دیر کر دی کہ ان سے پہلے بھارتی فوج کشمیر میں داخل ہو گئی اور پاکستان ہمیشہ کے لئے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف کتنی جنگیں لڑیں؟ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سکھوں نے پنجاب پر کسی مزاحمت کے بغیر قبضہ کر لیا تھا؟ اگر سرحد نے اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو پنجاب میں بھی قدم قدم پر جنگ ہوئی۔ اگر ہم ہار گئے تو آیئے آپ کو ایک جنگ کا حال سناؤں جو آپ کے بزرگوں نے لڑی تھی۔ یہ نوکھر (نوشہرہ) کی جنگ تھی۔ مارچ ۱۸۲۳ میں رنجیت سنگھ نے ہنڈ کے قریب دریائے سندھ کو پار کیا۔ دوسری طرف بنیر کے پیر بابا کے خاندان سے اکبر شاہ کی سرکردگی میں یوسف زئی اور خٹک لشکر جمع تھے جو سکھوں کی پیادہ فوج پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے اور اسے تتر بتر کر دیا۔ صرف رنجیت سنگھ کی گورکھا بٹالین جمی رہی یا دریا کے دوسرے کنارے سے اس کے توپ خانے نے قبائلی مجاہدین کا راستہ روکا۔ اس وقت فتح خان وزیر کے بھائی محمد اعظم خان نے جو کابل سے فوج لے کر آیا تھا موجودہ نوشہرہ سے تین میل مشرق کی جانب پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ یوسف زئی اور خٹک قبائل اس کا انتظار ہی کرتے رہ گئے لیکن اعظم خان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ دریا کے جنوبی کنارے سے سکھ توپ خانے کا تدارک کرتا۔ یوسف زئی اور خٹک قبائل تو اگلے دن پھر سکھوں پر دھاوا بولنے کو تیار تھے لیکن اعظم خان راتوں رات بھاگ گیا اور وہ بے یار و مدد گار رہ گئے تھے۔

رنجیت سنگھ جیت گیا۔ لڑے بغیر کوئی زخم کھائے بنا لیکن دل شکستہ اعظم خان نے چند روز بعد دم توڑ دیا۔ سر

اولف کیرو اپنی کتاب "دی پٹھانز" کے صفحہ ۲۹۷ پر لکھتا ہے

"اعظم تو مر گیا مگر ایک روایت چھوڑ گیا اب کوئی یوسف زئی ' کوئی آفریدی یا کوئی خٹک کسی محمد زئی سردار پر یہ اعتبار کرنے کو تیار نہیں کہ موقع پڑنے پر وہ ساتھ دے گا۔"

سکھوں کے سلسلے میں ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے۔ قبائل میں اس بات پر بہت آزردگی پائی جاتی تھی کہ انہوں نے رنجیت سنگھ کے سپہ سالار ہری سنگھ نلوہ کے ہاتھوں بار بار شکست کھائی تھی۔ ایسے میں حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ نے سکھوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور وہ ہجرت کر کے وسطی ہندوستان سے پشاور پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے پٹھان عوام کو نہیں پٹھان حکمرانوں کو رنجیت سنگھ کا وفادار پایا۔ بہرحال یوسف زئی ملکوں اور خٹک سرداروں نے ان کی پذیرائی کی۔ اس سلسلے میں نوکھر کی جنگ میں قبائلی لشکر کی کمان کرنے والے اکبر شاہ خصوصاً قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے سید احمد شہیدؒ کی ہر طرح مدد کی۔ مگر جب سید صاحب کو سکھوں اور ان کے وفادار پٹھان حکمرانوں پر ابتدائی فتوحات حاصل ہوئیں تو انہوں نے شادی بیاہ کی بعض رسموں اور رواجوں کو خلاف اسلام قرار دے دیا۔ یہیں سے معاملہ بگڑ گیا اور ان کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ نومبر ۱۸۳۰ء میں پختون سرداروں نے انہیں پشاور چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ مٹھی بھر وفادار مجاہدین کے ساتھ ہزارہ کی جانب کوچ کر گئے جہاں وادی کاغان کے قدموں میں بالا کوٹ کے مقام پر سکھوں نے انہیں آلیا اور شہید کر دیا۔

تو خان صاحب 'اگر اس وقت ہم سکھوں کے خلاف کامیاب نہ ہوئے تو آپ بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے بلکہ ان کے خلاف اٹھنے والوں کا ساتھ بھی نہ دے پائے۔ اس ضمن میں آپ نے میرے بارے میں ایک پریشانی کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرف تو میں اپنے آپ کو رنجیت سنگھ کا وارث تصور کرتا ہوں اور پورس اور رنجیت سنگھ کو اپنا ہیرو ماننے پر فخر محسوس کرتا ہوں مگر اسی سانس میں اسلامی مملکت خداداد پاکستان کی بات کرتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ میں نے کبھی اور کہیں رنجیت سنگھ کو اپنا ہیرو قرار نہیں دیا۔ باچا خان کے نام میرے خط میں تو رنجیت سنگھ کا نام تک نہیں آیا۔ میری کتاب "پنجاب کا مقدمہ" میں رنجیت سنگھ کا ضمناً ذکر ضرور موجود ہے لیکن اسے ان پانچ جواں مرد پنجابیوں میں شامل نہیں کیا گیا جنہیں میں نے پنجاب کے جذبہ مزاحمت کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ رہا پورس تو وہ میری دھرتی کا ایک ایسا سپوت تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے پیدا ہوا تھا اور اس کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ اس کا ٹکراؤ تو سکندر اعظم سے تھا جسے آپ بھی نہ روک سکے تھے چنانچہ وہ دندناتا ہوا جہلم تک آ پہنچا تھا۔ اگر مجھے راجہ پورس کی بہادری پر فخر ہے تو میرا یہ فخر مسلمان ہونے یا پاکستانی ہونے میں مانع نہیں۔ کیا آج کے مسلمان عربوں کو غیر مسلم حاتم طائی پر اور آج کے ایرانی مسلمانوں کو غیر مسلم سائرس

یا ذوالقرنین پر فخر نہیں۔ پنجاب ۱۹۴۷ء سے ' بلکہ برِ صغیر میں مسلمانوں کی آمد سے بھی پہلے یہاں موجود تھا۔ وہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہڑپہ کا وارث ہے۔ اگر مجھے اس کے بہادر اور مہذب ہونے پر فخر ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ آپ گاندھی پر فخر کرسکتے ہیں تو میں پورس پر کیوں فخر نہیں کر سکتا جبکہ اس بیچارے نے نہ اسلام کی مخالفت کی تھی اور نہ اس دھرتی کی۔ الٹا اس نے ایک حملہ آور کا منہ پھیرنے کے لئے اپنی رگوں کا خون اس دھرتی پر نچھاور کر دیا تھا۔

پھر آپ نے کنفیڈریشن اور مضبوط مرکز کی بحث چھیڑی ہے۔ دیکھئے خان صاحب! منطق کو الٹانے سے بدی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کبھی مضبوط مرکز کا حامی نہیں رہا۔ یہاں ' میرا مؤقف یہ ضرور ہے کہ وفاق میں نہ تو مرکز ہی بغیر پنشن کے بیوہ بن کر رہ جائے اور نہ صوبے ہی بے اختیار ہوں۔ وفاق صرف اس صورت میں قابل عمل اور مستحکم ہوتا ہے جب اس کا مرکز بھی ناقابل شکست ہو اور اس کی اکائیاں بھی۔ حقیقتاً وفاق کے سلسلے میں میرا مؤقف آپ سے خاصا قریب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں "لہٰذا" کے انداز میں بات کرتا ہوں اور آپ "ورنہ" کے لہجے میں۔ میں کہتا ہوں "چونکہ ہم نے پاکستان میں مل جل کر رہنا ہے لہٰذا ہمیں ایک دوسرے کو اس کا حق دے کر چلنا ہوگا۔" آپ کہتے ہیں "ہمیں ہمارا حق دو ورنہ ہم علیحدہ ہو جائیں گے۔" میں کہتا ہوں "اگر پنجاب کو وسائل سے محروم رکھنے کی روش برقرار رہی تو وہ مجبوراً مضبوط مرکز کے تصوّر کی حمایت کرے گا۔" آپ کہتے ہیں "اگر چھوٹے صوبوں کو صوبائی خود مختاری نہ دی گئی تو وہ مجبوراً فیڈریشن کے بجائے کنفیڈریشن بلکہ علیحدگی کی طرف چلے جائیں گے۔" اگر آپ میری بات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں مضبوط مرکز کا حامی ہوں تو پھر آپ کی بات سے بھی یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ آپ کنفیڈریشن اور علیحدگی چاہتے ہیں۔

خان صاحب! میں وہ پنجابی ہوں جس نے ۱۹۷۵ء میں بھٹو مرحوم سے صوبائی خود مختاری ہی کے مسئلے پر اختلاف کرتے ہوئے مرکزی وزارت کی تحریری پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ اگر محترم قسور گردیزی کی روایت غلط نہیں تو اس موقع پر آپ اور آپ کے ساتھیوں نے نیپ پر پابندی کے بعد مجوزہ این۔ ڈی۔ پی کی صدارت مجھے پیش کی تھی۔ صوبائی خود مختاری ہی کے مسئلے پر میں نے شاہی قلعے سے اٹک جیل تک کا سفر کیا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں بھٹو حکومت کی طرف سے اس وقت کے اٹارنی جنرل مسٹر یحییٰ بختیار پیش ہوئے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ اور جسٹس محمد افضل ظلہ کی عدالت میں ان کا یہ اقرار ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں نے صوبائی خود مختاری پر اس حد تک اصرار کیا کہ جیل جانا منظور کر لیا میں نے نہ صرف مرکزی وزارت کی پیشکش بلکہ وہ پیپلز پارٹی بھی چھوڑ دی جسے میں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ اب دس سال بعد "پنجاب کا مقدمہ" شائع ہوئی ہے ' اس کے باب "پنجاب کی ذمہ داری" کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیں

"اگر پاکستان کو ایک وفاقی ریاست کی طرح چلانا ہے تو پنجاب کو اپنے رویے میں لازماً تبدیلی کرنی ہوگی۔ اگر پنجاب کو پاکستان اپنے سے بھی زیادہ عزیز ہے تو اسے پاکستان کی خاطر اہتمام کرنا ہوگا کہ چاروں صوبے پاکستان میں خوش اور خوش حال رہیں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ پاکستان کو ایک ایسا گھر بنایا جائے جس کی بیرونی چار دیواری تو ایک ہو لیکن اس کے اندر چار خود کفیل حصے یا انڈی پنڈنٹ پورشن ہوں اور ہر پورشن میں آباد صوبہ اپنے اپنے پورشن میں خود مختار ہو۔ پنجاب کو چاہئے کہ پاکستان میں اپنے آپ کو نہ تو باپ سمجھے اور نہ بڑا بھائی' بہتر ہے کہ وہ سندھ' سرحد اور بلوچستان کا جڑواں بھائی بنے اور چاروں بھائی باہمی فیصلوں کی حد تک ایک دوسرے کی برابری تسلیم کریں۔"

خان صاحب! میں انصاف پسند پختون عوام کو گواہ بنا کر پوچھتا ہوں کہ جو شخص پچھلے دس گیارہ سال سے پنجاب میں بیٹھ کر پنجاب کو وفاق کے تقاضے اور صوبائی خود مختاری سمجھا رہا ہے اور پنجاب کے مرکز پسند مزاج کے خلاف ایک طرح کا جہاد کر رہا ہے آپ اسے مضبوط مرکز کا حامی کیسے کہتے ہیں۔ اور تو اور آپ اسے اس "بیہودہ" خواہش میں گرفتار قرار دیتے ہیں کہ وہ چھوٹے صوبوں کو محکوم بنانا چاہتا ہے۔ جس طرح میں کنفیڈریشن اور علیحدگی کی ہر تحریک کو پاکستان دشمنی سمجھتا ہوں اسی طرح میں مضبوط مرکز کے روایتی تصوّر کو غلط کہتا ہوں۔ مقصد تو پاکستان کو مضبوط بنانا ہے۔ نہ وہ کنفیڈریشن سے مضبوط ہو سکتا ہے اور نہ مضبوط مرکز سے۔ کل مشرقی پاکستان اگر بنگلہ دیش بن گیا تھا تو اسی مضبوط مرکز کی بدولت اور اگر آج پاکستان کو کنفیڈریشن اور علیحدگی کی تحریکوں سے خطرہ ہے تو یہ صورت حال بھی اسی مضبوط مرکز ہی کا ردِّ عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ بچاؤ کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے وفاق کی راہ۔ لیکن کیا وفاق صرف اس طرح بن سکتا ہے کہ پنجاب کو اس کے سابقہ کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ہوئے اس کے اپنے وسائل سے محروم کر دیا جائے' اس کے دریا بیچ دیئے جائیں' اسے پانی کے متبادل انتظامات میں سے بھی مناسب حصہ نہ دیا جائے' اسے بڑی صنعتوں میں جبراً پس ماندہ رکھا جائے' اسے بجلی کے لئے دوسرے صوبوں کا دست نگر بنا دیا جائے' اس کے بیٹے پردیس میں دھکّے کھا کر زرِ مبادلہ کما کر لائیں لیکن اسے قومی وسائل میں سب سے پیچھے رکھا جائے۔ اوپر سے فوج اور نوکر شاہی میں اس کی عددی کثرت کے نام پر اسے حکومت کا اجارہ دار اور بقول آپ کے "پاکستان کا ماما" قرار دے دیا جائے اور یہ بھی نہ سوچا جائے کہ فوجی حکومتوں اور نوکر شاہی کا پنجاب کے پانچ کروڑ محنت کش عوام سے جو ہو بہو وہی سلوک ہوتا ہے جو وہ دوسرے صوبوں کے عوام سے کرتی ہے۔ ویسے میری ایک ناچیز گزارش ہے کہ اگر ماما گیری بری ہوتی ہے تو دادا گیری بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی مناسب نہیں کہ ہر وقت پنجاب کو کٹہرے ہی میں کھڑا رکھا

جائے۔ ماماگیری کے ساتھ ساتھ پنجاب کی تھانے داری کا بھی بہت چرچا کیا گیا ہے۔ کسی چھوٹے صوبے میں متعین پنجابی تھانے دار کسی ملزم کو دس جوتے لگانے کا فیصلہ کرتا ہے تو ساتویں آٹھویں جوتے پر ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پنجاب میں تو وہ دس کی جگہ بیس جوتے بھی لگا جائے تو اسے اطمینان ہوتا ہے کہ یہاں مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ پنجاب والے پنجابی نوکر شاہی یا پنجابی تھانے دار سے اتنے ہی تنگ ہیں جتنے دوسرے۔ ہم تو خوش ہوں گے جب دوسرے صوبوں میں مکمل طور پر وہاں کی اپنی نوکر شاہی کام کر رہی ہوگی' وہ چاہے جتنے جوتے مارے ہمیں تو گالی نہیں پڑے گی۔

خان صاحب! میں جس "بیہودہ" خواہش میں مبتلا ہوں وہ آپ پر حکومت کرنا نہیں بلکہ آپ کو یقین دلانا ہے کہ جس طرح نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کا وہ دور گزر گیا جب آپ کے بزرگ ہماری زمینوں کو روندتے ہوئے دلی کی مسلمان حکومتوں کا تختہ الٹنے تشریف لاتے تھے اسی طرح سکھوں کا عہد بھی گزر گیا جب پنجاب کا عمل دخل کابل تک پھیل گیا تھا۔ یہ ماضی کی باتیں ہیں۔ جنہیں مستقبل میں بڑے کام کرنے ہوتے ہیں وہ ماضی کی چھوٹی باتوں میں نہیں الجھا کرتے۔ آیئے مستقبل کی فکر کریں۔ وہ مستقبل جو چاروں صوبوں کے عوام کے لئے آزادی اور مساوات کی نعمتیں لے کر آئے۔ خان صاحب! تاریخ کو اپنے لئے ایک دلدل نہ بنایئے۔ آیئے 'ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اس دلدل سے نکل جائیں۔ اگر آپ یہی گنتے رہے کہ آپ نے سکھوں کے خلاف کتنی جدوجہد کی اور پنجاب نے کتنی اور اپنے آپ کو پنجاب سے زیادہ نمبر دے کر پنجاب کے بارے میں تحقیر آمیز رویّہ اختیار کئے رکھا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا کہ تنگ آمد بجنگ آمد' پنجاب بھی آپ کو وہ فوجی اور سیاسی شکستیں یاد دلاتا رہے گا جو تاریخ کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں۔ خان صاحب.........! تاریخ تو ایک ایسی سیال حقیقت ہے جسے آپ اپنے مخصوص نقطہ نظر سے جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں۔ یہ بڑی دردناک اور سنگین بات ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ کے آباؤاجداد نے ہمیں اسلام کا تحفہ دیا۔ شاید آپ ان حملہ آور سلطانوں کا ذکر کر رہے ہیں جو شمال سے ہماری سرزمین پر وارد ہوتے رہے۔ بے شک ان میں سے چند کے ساتھ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگ بھی یہاں تشریف لائے لیکن جہاں تک ان حملہ آور سلطانوں کا تعلق ہے ان میں سے کسی ایک کا مقصد بھی اسلام کی ترویج نہ تھا۔ کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی یہاں اسلام پھیلانے آئے تھے؟ ظاہر ہے کہ نہیں' اور اگر اسلام کی اشاعت کا سہرہ حملہ آوروں کے سر باندھنا ہے تو ان حضرات سے بہت پہلے سمندر کے راستے محمد بن قاسم تشریف لائے تھے۔ میرے اپنے آباؤاجداد اسی کے ساتھ شام سے آئے تھے۔ مسلمان لشکر میں "رامی" تیراندازوں اور "رامح" نیزہ بازوں کو کہا جاتا تھا۔ جس طرح ان کے تیر اور نیزے کی انی ہندوستان کی فضا میں ہل کا پھل بن گئی اسی طرح رامی اور رامح کا تلفظ یہاں رامے ہو گیا۔ اب بھی اگر تسلی نہ ہوئی ہو کہ کس کے آباؤاجداد نے کس

کے آباؤاجداد کو مسلمان بنایا تھا تو پھر تاریخ کے دو ایک ورق مزید پلٹ لیجئے۔ آپ کے قدیم صحائف منہ سے بولیں گے کہ آپ ان یہودی قبائل کے وارث ہیں جو ہیکل سلیمانی کی تباہی کے بعد ہجرت کر کے ان علاقوں میں آن آباد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب "جی سس ان ہیون آن ارتھ" بھی یہی کہانی سناتی ہے۔ تو تاریخ میں کیا رکھا ہے؟ ایک تاریخ لکھی جا چکی ہے جو حملہ آوروں اور حکمرانوں کی تاریخ تھی۔ ایک تاریخ ابھی لکھی جانی ہے جو طبقات اور عوام کی تاریخ ہو گی۔ توڑنے والی تاریخ کو بھول جایئے 'جوڑنے والی تاریخ لکھنے کا جتن کیجئے جس میں یہ نہ دیکھا جائے کہ کشتی میں سوراخ کس نے کیا تھا بلکہ یہ پیش نظر رہے کہ کشتی پار لگانے کا شرف کسے حاصل ہوا اور کس کس نے اپنے اپنے حصے کا چپّو چلانے میں کمی نہ کی۔

خان صاحب! آیئے وہاں سے ابتدا کرتے ہیں جہاں انگریزوں نے ہم سب کو محکوم بنا لیا۔ چلئے میں آپ کو سو میں سے سو نمبر دے دیتا ہوں کہ آپ نے انگریز کے خلاف بہت قابل قدر مزاحمت کی۔ لیکن آپ یہ بھی تو جانتے ہیں کہ ۱۸۴۹ء میں لاہور پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا اور اس کے صرف آٹھ سال بعد ۱۸۵۷ء میں ساہیوال اور اوکاڑہ کے میدانوں اور جنگلوں میں پنجابیوں نے احمد خان کھرل کی سرکردگی میں جنرل منٹگمری اور برکلے کے خلاف جنگ آزادی لڑی تھی۔ پھر کیا آپ لاہور 'امرتسر اور قصور کے علاقہ ماجھا میں نظام لوہار کو انگریز پولیس افسروں کی گردنیں اڑاتا نہیں دیکھ سکتے۔ کیا آپ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو آزادی وطن کے لئے جان پر کھیلتے اور پھانسیوں پر جھولتے نہیں دیکھ سکتے۔

خان صاحب! سوچئے کہ کوکا لہر' پگڑی سنبھال جٹا' بھرتی بند تحریک' ریشمی رومال' غدر پارٹی' انٹی رولٹ ایکٹ تحریک' تحریک خلافت' ہجرت تحریک' نہ مل ورتن تحریک' نوجوان بھارت سبھا' انڈین سوشلسٹ ری پبلکن آرمی' نیلی پوش' تحریک حریّت کشمیر' خاکسار تحریک اور مجلس احرار اسلام جیسی انقلاب دوست اور سامراج دشمن تحریکیں کہاں پیدا ہوئیں اور کہاں پروان چڑھیں؟ پنجاب کے بوڑھے درخت آج بھی ان ہزاروں مجاہدین آزادی کی قربانیاں یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں جنھیں ان درختوں کی شاخوں سے انگریز نے اس لئے لٹکا دیا تھا کہ پنجابی عوام کا جذبہ مزاحمت سرد پڑ جائے۔ آپ کو یہ بھی یاد ہونا چاہئے کہ جب سبھاش بابو نے پنجابی جرنیلوں موہن سنگھ اور احسان قادر سے مل کر آزاد ہند فوج بنائی تھی تو اس کے اسی فیصد ارکان پنجابی تھے۔

خان صاحب! آیئے اپنے اپنے مجاہدین آزادی کی ایک ساتھ قسم کھا کر عہد کریں کہ ہم نے سرزمین پاکستان سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنا ہے 'نوکر شاہی کو لگام دینی ہے 'فوج کو سیاست سے نکالنا ہے اور انگریز سامراج کے وارث امریکی سامراج کو اسی طرح واپس بھیجنا ہے جس طرح ہمارے اور آپ کے آباؤاجداد نے اپنی قربانیوں سے انگریزوں کو واپس بھیجا تھا۔

اس موقع پر ضروری ہے کہ ہم اس بحث کے مرکزی نکتے پر خصوصی توجہ دیں۔ دال میں جتنا

بھی کالا ہے وہ اسی ایک نکتے سے تعلق رکھتا ہے اور اس نکتے کا قیام پاکستان سے تعلق ہے۔ آپ کے خط کی سطر سطر سے یہ دکھ سیاہی کی طرح نچڑتا دکھائی دیتا ہے کہ آپ کی پوری کوشش کے باوجود پاکستان کیوں بن گیا۔ آپ کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ آپ پنجاب کا یہ جرم معاف کرنے پر تیار نہیں کہ اس نے پاکستان کیوں بنوا دیا۔ آپ بار بار اس طرح کے جملے لکھتے ہیں۔ .... "پنجاب آپ (پنجابیوں) نے تقسیم کروایا۔" .... "معلوم نہیں کہ رائے صاحب کی یہ پنجابی ذہنیت کب آرام سے بیٹھے گی، پہلے ہندوستان تو کیا مسلمانان ہند کو تقسیم کروایا، مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں بنگال اور پنجاب کو تقسیم کروایا، پنجاب کو تقسیم کروا کر گورداس پور ہندوستان کے حوالہ کروایا۔" ذرا ان جملوں پر دوبارہ نظر ڈالئے۔ آپ صاف صاف کہ رہے ہیں کہ پاکستان بنانا غلط تھا کیونکہ پاکستان کے قیام کی وجہ سے پنجاب اور بنگال تقسیم ہوئے۔ ان جملوں سے یہ بھی عیاں ہے کہ آپ اس "غلطی" کا جرم پنجاب کی گردن پر ڈالتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی سانس میں آپ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ "خدائی خدمت گار اور کانگریس کی متحدہ جدوجہد کے نتیجے میں یہ ملک آزاد ہوا اور آپ کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر بیٹھنے کا شرف نصیب ہوا............"

شاید آپ کہنا چاہتے ہیں کہ ملک کو آزاد تو آپ نے کرایا البتہ تقسیم اسے پنجاب نے کرایا۔ اس کے علاوہ آپ فرماتے ہیں کہ "ہم قطعاً معذرت خواہ نہیں کہ ہم نے انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر ان قوتوں سے تعاون کیا جو حقیقتاً اس مادر وطن کی آزادی کے لئے میدان میں نکلی تھیں۔ اگر آپ مہاتما گاندھی اور کانگریس کی پیروی پر معذرت خواہ نہیں جو ہندوستان کو کامل آزادی دلانے کے بجائے اسے برطانوی راج کے تحت ڈومینین بنانا چاہتے تھے تو ہم پنجابی بھی قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان میں شرکت پر فخر محسوس کرتے ہیں جن کا مطالبہ کامل آزادی تھا۔ پاکستان بے شک ہمارا خواب تھا، مجھے تسلیم ہے کہ سامراج کے تسلط کے باعث ابھی تک اس خواب کی تعبیر ممکن نہیں ہوئی نہ ہی کامل آزادی ملی ہے لیکن ہمارا خواب ابھی زندہ ہے۔ خان صاحب! میں اس خواب کی تکمیل کے لئے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آیئے ایک نیا سفر آغاز کریں۔ پاکستان تو بن گیا اور آپ کی کوشش اور خواہش کے خلاف بن گیا۔ اب اپنی صلاحیتوں کو اس میں کیڑے ڈالنے کے بجائے اسے سنوارنے اور صحیح معنوں میں آزاد کرانے پر کیوں خرچ نہ کیا جائے اور آپس میں رحمت ابھار کر پاکستان کے دشمنوں کے ساتھ شدت کیوں نہ برتی جائے۔

یہاں میں ایک مرتبہ پھر وہ الفاظ دہراتا ہوں جو میں نے آپ کے والد محترم کے نام اپنے خط کے آخر میں لکھے تھے کہ "آپ نے چالیس سال تک ہم سے دشمنی کر کے دیکھ لی اب چار دن دوستی کر کے بھی دیکھ لیں۔ انشاءاللہ ہم دونوں کا بھلا ہو گا۔" البتہ اپنے ان الفاظ میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر

آپ نے دوستی کا ہاتھ قبول کر لیا تو اس سے پورے ملک اور اس کے سارے عوام کا بھی بھلا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے تنگ نظر قومیت پرستی اور صوبائیت سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو پنجاب کو وفاق کے تقاضے سمجھانے کی خاطر پنجاب سمیت تمام صوبوں کے حقوق کی بات کرتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے مجبوراً خطاب کیا ہے تو میں نے بھی بادل ناخواستہ ہی آپ کو جواب دیا ہے۔ میرے لئے اس بحث کا ایک ہی فائدہ ہے کہ آپ جان جائیں کہ پنجاب اب بلاجواز جوتے اور گالیاں کھانے کو تیار نہیں۔ میں اپنی طرف سے اس بحث کو ختم کرتا ہوں اگر آپ نے ملک اور مظلوم طبقات کی خاطر دوستی کی پیشکش قبول کر لی تو یقین جانیں کہ اس سرزمین سے نہ صرف سرمایہ داری' جاگیرداری 'نوکر شاہی اور مارشل لاء کا غلبہ مٹ جائے گا بلکہ ان تاریخی لعنتوں کا وہ سرچشمہ بھی ختم ہو جائے گا جس کا نام سامراج ہے اور جس نے ہمیں باہم بانٹ کر 'ایک دوسرے سے دست و گریبان کر کے ہمیشہ ہماری قیمت پر اپنے مفادات حاصل کئے۔ اس کے برعکس اگر آپ نے دوستی کا یہ ہاتھ جھٹک دیا تو پاکستان اور اس کے چاروں صوبوں کے عوام کے ساتھ ساتھ خود صوبہ سرحد اور اس کے عوام کے ساتھ جو کچھ بیت جائے گا اس کی کھلی کھلی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔

خوش آمدید کہنے کی امید میں خدا حافظ..................

محمد حنیف رامے